قائدِ اعظم

حیات و خدمات

تصنیف
شریف المجاہد
ترجمہ
خواجہ رضی حیدر

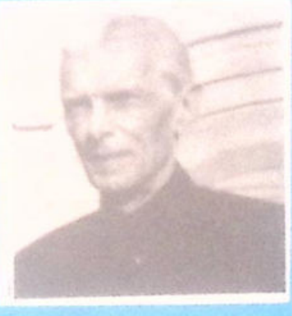

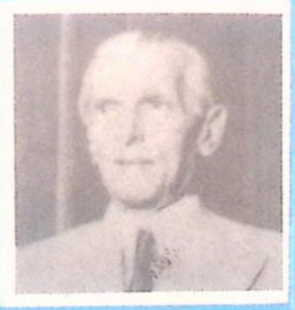

MAAB 1431
maablib.org

سوانحی مطالعہ ـــــــــ ۵

قائداعظم: حیات و خدمات

maablib.org

محمد علی جناح، ان لوگوں کے لیے جن کی انہوں نے رہنمائی کی قائداعظم سے بھی بڑھ کر کچھ اور تھے، اور جس اسلامی قوم کی تشکیل انہوں نے خود کی تھی، وہ اس کے معمار ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تھے۔

دی ٹائمز (لندن) ۱۳/ستمبر ۱۹۴۸ء

قائداعظم

حیات و خدمات

تصنیف

پروفیسر شریف المجاہد

ترجمہ

خواجہ رضی حیدر

کراچی

قائداعظم اکادمی

۱۹۸۳

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

ناشر ———— قائدِ اعظم اکادمی

۲۹۷- ایم اے جناح روڈ کراچی

طابع ———— احمد برادرز پرنٹرز

کمرشیل ایریا ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

طبع اوّل ———— دسمبر ۱۹۸۳ء

قیمت ———— (سستا ایڈیشن) ۱۲ روپے

(اعلیٰ ایڈیشن) ۲۵ روپے

maablib.org

فہرست

۱	پیش لفظ	۷
۲	مقدّمہ	۹
۳	حرفِ آغاز	۱۱
۴	ابتدائی زندگی اور نشوونما	۱۴
۵	سیاسی رجحان کا پس منظر	۱۹
۶	پارلیمانی دور	۲۸

۷	جناح، کانگریس اور مسلم لیگ	۳۴
۸	جناح اور ہندو مسلم مفاہمت	۴۹
۹	جناح اور مسلم اتحاد	۶۴
۱۰	مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ	۷۶
۱۱	مطالبۂ پاکستان اور اس کا پس منظر	۹۷
۱۲	پاکستان کی جانب پیش رفت	۱۰۹
۱۳	قائد اعظم اور استحکام پاکستان	۱۳۴
۱۴	حرف آخر	۱۴۰
۱۵	اشاریہ	۱۴۵

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قائداعظم کی حیات و خدمات پر گزشتہ چالیس سال کے عرصہ میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں بنیادی ماخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود ابھی قائداعظم کے بارے میں بے پناہ تحقیق و تشریح کی گنجائش موجود ہے۔ ہمارے ملّی تقاضوں اور خصوصاً نئی نسل کے ذہنی رویّوں کے پیشِ نظر ایک ایسی کتاب کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے جو قائداعظم کی جامع، مدلّل اور واضح تصویر کشی کر سکے۔

قائداعظم کے افکار و خیالات، ان کی قومی جدوجہد اور سوانحی گوشوں کو مربوط و واضح کرنا اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر و اشاعت قائداعظم اکادمی کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس ضمن میں اکادمی نے نہایت مختصر عرصہ میں قابلِ ذکر پیش رفت کی ہے۔ اور متعدد ایسی سوانحی و تشریحی کتب شائع کی ہیں جن سے محققین کے علاوہ عام افراد بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ پروفیسر شریف المجاہد کی کتاب "قائداعظم حیات و خدمات"، کا اردو ترجمہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کا ترجمہ نہایت سلیس اور رواں کیا گیا ہے تاکہ قاری کہیں بھی کسی قسم کے لفظی، معنوی یا واقعاتی الجھاؤ کا شکار نہ ہو۔

اس تصنیف میں قائداعظم کی حیات و خدمات کو اسی مقصد کے تحت پروفیسر شریف المجاہد نے اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے تاکہ نئی نسل، خصوصاً

کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے طالب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو سکیں کہ قائد اعظم نے وہ کون سی خدمات انجام دی تھیں جن کی بنا پر بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشروں میں محمد علی جناح برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے نہ صرف ہر دلعزیز قائد بن کر ابھرے بلکہ مسلمانانِ ہند ان کی قیادت میں پاکستان کے حصول کے لئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد و منظم ہو گئے۔

پروفیسر شریف المجاہد کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک عام فہم سوانحی اور تجزیاتی کتاب ہے جو نہایت وسیع اور سنجیدہ مطالعہ پر مبنی، محققانہ اور معروضی نقطۂ نظر کی آئینہ دار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس موضوع پر یہ ایک مفید کتاب ثابت ہو گی۔

مسعود نبی نور

چیئرمین

ایگزیکیٹو کمیٹی قائد اعظم اکادمی

اسلام آباد

۱۰ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ

۱۶ نومبر ۱۹۸۲ء

مقدمہ

قائداعظم محمد علی جناح کی ایک بھرپور، مبسوط اور ایسی جامع سوانح جس پر قولِ فیصل ہونے کا حکم لگایا جا سکے اگرچہ ابھی تک وہ حقیقتِ منتظر ہے جو نگاہ مجاز میں نہیں آئی تاہم اس دوران میں قائداعظم کی شخصیت، ان کی قیادت کے انداز، اس کی وسعت اور اس کے اوصاف کے بعض ناقدانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سمت کچھ نہ کچھ کوششیں ضرور کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں قائداعظم اکادمی کے زیراہتمام شائع ہونے والی کرم حیدری کی کتاب "ملّت کا پاسبان" (۱۹۸۱) جہاں بنیادی معلومات پر مبنی قائداعظم کی پہلی مستند سوانح ہے، وہیں "قائداعظم جناح۔ اسٹڈیز ان انٹرپریٹیشن" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، ایسی کتاب ہے جس میں نہ صرف قائداعظم کی سیاسی زندگی میں پیش آنے والے پیچیدہ اور حل طلب مسائل پر بحث کی گئی ہے بلکہ پہلی مرتبہ ان گوناگوں مسائل کو تحلیل و تجزیے کی بنیاد پر مجموعی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے علاوہ ازیں اکادمی نے دو ضخیم توضیحی کتابیات (۱۹۷۸۔۱۹۷۹) اور ایک جامع کرونولوجی (۱۹۸۱) بھی شائع کی ہیں۔ یہ تمام کتب جناح پر کام کرنے والوں کے لئے مفید اور معاون تحقیقی مواد ثابت ہو سکتی ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق اب تک قائداعظم پر انگریزی میں ۷۰، اور اردو میں ۹۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے صرف انگریزی میں ۱۳ کتابیں ایسی ہیں جن میں تخلیقی اپروچ سے کام لیا گیا ہے، جب کہ اردو میں ایسی کتب کی تعداد قدرے کم ہے۔ بہرحال قائداعظم کی ایک ایسی مختصر سوانح کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی، جس میں ان کی زندگی کے تمام اہم واقعات نہ صرف قرینے، قاعدے اور سلیقے سے بلکہ اجمالی تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کئے گئے

ہوں جس سے ان کے افکار اور سیاست کے ارتقاء اور پیش رفت کی ایک مربوط اور مسلسل کہانی ہی سامنے نہ آتی ہو بلکہ وہ برِاعظم ہندوستان میں مسلم سیاست کے ارتقاء اسلامیانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ، ان کے از سرِ نو عروج اور پاکستان کی سمت ان کی فاتحانہ پیش قدمی کی داستان بھی ہو۔ زیرِ نظر کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

جنوبی ایشیا میں تحریر کی جانے والی سوانحوں میں بالعموم ایک نقص ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مصنفین و مرتبین اس بنیادی اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ایک سوانح کو ثانوی طور پر ایک عہد کی سیاسی تاریخ ہونا چاہیئے، جب کہ اصل توجہ اس عہد کے حالات اور واقعات کی بجائے اس شخص پر مرکوز رہنی چاہیئے جس کی سوانح قلمبند کی جا رہی ہو۔ ہماری تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن رکھا جائے، تاہم جہاں کہیں ضروری محسوس کیا گیا ہے تو جناح کے رویّے، اندازِ فکر، اقدامات اور جوابی اقدامات کو قدرے تفصیل کے ساتھ یعنی بامعنی اور بامقصد تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ کوشش یہی کی گئی ہے کہ اس کتاب میں جناح کی داستانِ حیات کو آزادی اور تقسیم ہند کی سمت ہندوستانی سیاست کی پیش قدمی کے تناظر میں از سرِ نو ایک بنیادی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ خواجہ رضی حیدر نے کیا ہے جب کہ ترجمے پر نظرِ ثانی اور اسے بہتر بنانے میں جناب افسر آذر نے مفید مشوروں سے نوازا ہے جس کے لئے میں ہر دو حضرات کا شکر گزار ہوں۔ تاہم اگر کوئی خامی یا کمی ہے تو اس کی تمام تر ذمّے داری مصنّف پر ہے۔

آخر میں زیرِ نظر کتاب اور اس کے ناشر کے بارے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب میں جن خیالات، نظریات، توضیحات و تشریحات سے کام لیا گیا ہے وہ خالصتہً مصنف کے اندازِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ قائد اعظم اکادمی یا کوئی اور ادارہ اس کا ذمّہ دار نہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۸۳ء — شریف المجاہد

حرفِ آغاز

تاریخ کے معیار پر اگر پرکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح نظر آتی ہے کہ قائدِ اعظم نے اپنی طویل اور انتہائی مصروف عوامی زندگی (۱۹۰۵ تا ۱۹۴۸) میں جو کارنامے انجام دیئے ان میں استقلالِ پاکستان سب سے عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ان کی شخصیت پہلو دار اور گونا گوں تھی، ان کی زندگی ہنگامہ خیزیوں سے عبارت تھی۔ فتح و نصرت ہر ہر گام پر ان کے لئے فرشِ راہ رہتی تھی۔ بے شمار کامیابیوں میں قیامِ پاکستان بہر حال ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ زندگی کے مختلف مراحل اور ادوار میں انہوں نے مختلف حیثیتوں سے، مختلف فرائض نہایت حسن و خوبی سے ادا کیئے۔ ہندوستان نے اس صدی کے ابتدائی نصف میں جو عظیم اور نامور قانون دان پیدا کیئے، قائدِ اعظم ان میں سے ایک تھے۔ وہ واقعی ایک جامعِ کمالات شخصیت تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلائے، قانون سازی کے میدان میں انہوں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ پارلیمنٹیرین کے روپ میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ سیاست دان کی حیثیت سے ان کی شان ہی سب سے الگ تھی، مجاہدِ آزادی کے کردار میں ان کا انتھک جوش و خروش اپنی نظیر آپ تھا۔ عوامی رہنما کی حیثیت سے ان کی اولوالعزمی اور ولولہ انگیزی مثالی تھی۔

بساطِ سیاست پر حکمت عملی کے ایسے ماہر کہ بسمارک کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہر اعتبار سے ایک جامع اور مکمل معمارِ قوم تھے۔ اپنی شخصیت کے اس روپ میں وہ واشنگٹن۔ بسمارک، کیور، گیریبالڈی، لینن، اتاترک اور مسارک جیسے عصرِ جدید کے عظیم رجالِ عالم کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں لیکن جو بات قائدِ اعظم کو ان سب سے ممتاز اور ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے ان عظیم رہنماؤں نے روایتی طور پر مسلّمہ اور متعینہ اقوام کی قیادت کر کے انہیں آزادی سے ہمکنار کیا، مگر قائدِ اعظم نے ایک منتشر اور پسماندہ اقلیت کی شیرازہ بندی کر کے اسے نہ صرف اپنی علیحدہ قومیت کا احساس دلایا بلکہ ایک قوم کے قالب میں ڈھالا۔ مزید براں اس نو دریافت قوم کو ایک علیحدہ جغرافیائی وجود حاصل کرنے کے جذبے سے سرشار کیا اور مطالبۂ پاکستان کو مسلم ہندوستان کا اعلیٰ و ارفع مقصدِ حیات بنا کر اس قوم کی آزادی کی سمت رہنمائی کی اور بالآخر اس کے لئے ایک وطن ہی حاصل نہ کیا بلکہ نہایت نامساعد، خطرناک اور کٹھن حالات میں اس نوزائیدہ قوم کی بقا اور حیات کو محفوظ و مامون بھی بنایا۔

وقت اور حالات کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ ہمہ رخی کامیابی جناح کی قائدانہ صلاحیتوں ہی کا اعجاز تھی۔ اپنی عملی زندگی کے ابتدائی تین عشروں تک وہ بہت سے رہنماؤں میں سے ایک رہنما کی حیثیت سے اپنا یہ قائدانہ کردار ادا کرتے رہے، پھر ۱۹۳۰ء کے بعد وہ اسلامیانِ ہند کے مسلّمہ اور غیر متنازعہ رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اس حیثیت سے وہ کم و بیش تیس برس تک اسلامیانِ ہند کے معاملات اور امور کی نگرانی اور رہنمائی کرتے رہے۔ تیس برس تک وہ نہ صرف ان کی جائز اور قانونی امنگوں، خواہشات اور دیرینہ خوابوں کی ترجمانی کرتے رہے بلکہ انہیں ربط و ہم آہنگی اور مقصدیت سے ہمکنار

بھی کرتے رہے۔ تیس برس تک وہ اسلامیانِ ہند کی جملہ خواہشات، ضروریات اور تقاضوں کو ٹھوس مطالبات کی شکل میں پیش کرتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسی تیس برس کے عرصے میں جناح ان تمام مطالبات کو مسلمانوں کے دو حریف فریقوں سے منوانے اور تسلیم کرانے کے لئے سعی و کاوش میں بھی شبانہ روز مصروف رہے۔ ان فریقوں میں سے ایک حکمران تھا یعنی انگریز، اور دوسرا فریق کثیر التعداد زیادہ بااثر اور بارسوخ، سیاسی طور پر کہیں زیادہ منظم اور زیادہ طاقتور تھا یعنی ہندو۔ یوں وہ تیس برس تک براعظم ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آبرومندانہ طور پر زندہ رہنے کا پیدائشی حق منوانے کے لئے برسرِ پیکار اور سینہ سپر رہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے جناح کی داستانِ حیات صرف ایک فرد کی داستان نہیں بلکہ یہ اسلامیانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ اور ایک قوم کی حیثیت سے اس کے نہایت استحکام اور استقامت، جلال و شکوہ کے ساتھ اور پوری توانائی سے ابھرنے کی داستان بھی ہے۔

ابتدائی زندگی اور نشو ونما

۱۸۷۶ تا ۱۹۰۵

۱۸۵۷ء وہ سال ہے جب ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف غدر برپا ہوا۔ اس شورش کو برطانوی اخبارات اور مصنفین غلط طور پر "بغاوت ہند" سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ برصغیر ہندو پاک کے لوگ اس کا تذکرہ نہایت محبّت اور عقیدت کے ساتھ "پہلی جنگ آزادی" کے طور پر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جنگِ آزادی نے نہایت برق رفتاری اور پوری شدت کے ساتھ شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن بالآخر برطانیہ کی قوت اور فوجی برتری کے مقابلے میں اسے ناکامی اور نامرادی سے دو چار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کے لئے اس ناکامی کے نتائج بڑے بھیانک اور تباہ کن ثابت ہوئے۔ وہ سیاسی قوت سے محروم ہو کر، براعظم ہندوستان میں اپنی طویل تاریخ کے دوران پہلی مرتبہ محکوم اور غلام بنے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کیونکہ مسلمان ہی پیش پیش تھے اس لئے اس کی پاداش میں انہیں مختلف طریقوں سے انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ ان پر مقدمے چلائے گئے۔ انہیں پھانسیاں دی گئیں، ان پر جرمانے عائد کئے گئے۔ ان انتقامی کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامیانِ ہند من حیث القوم انتہائی مایوسی، ناامیدی اور کسمپرسی کی گہری تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

اس ناگفتہ بہ صورتِ حال سے نکل کر ایک منظم قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے ابھرنے کی داستان بہت طویل ہے لیکن اس سمت میں پہلا قدم سر سید احمد خان (۱۸۱۷ تا ۱۸۹۸) نے اٹھایا۔ انہوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بداعتمادی کے خاتمے اور مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی مساعی کی۔ سماجی اصلاحات پر زور دیا، اپنے ہم مذہبوں کو قعرِ مذلت اور پسماندگی و پسپائی سے نکالنے کے لئے انہیں جدید تعلیم کی طرف راغب کیا۔ مسلمانوں کے لئے انہوں نے جو تعلیمی پروگرام وضع کیا تھا اسے قطعی اور ٹھوس شکل میں بروئے کار لانے کے لئے علیگڑھ میں مئی ۱۸۷۵ء اور جنوری ۱۸۷۷ء میں علی الترتیب ایک اسکول اور ایک کالج قائم کیا۔

علی گڑھ کالج کے قیام سے دو ہفتے قبل، ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ٹھیک ستّر برس بعد مسلمانوں کی سیاسی بحالی اور برصغیر میں مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ سے متعلق سرسید کے مشن کو اس کی کلیّت کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے کا وسیلہ اور سبب بنے۔ قائداعظم ایک ممتاز تاجر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد راجکوٹ کے ایک تاجر تھے جو چند برس قبل کراچی آکر آباد ہو گئے تھے۔

جناح کا بچپن اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے دیگر ہم عمروں سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ تاہم شروع ہی سے وہ اپنی نفاست پسندی، جرأت اور بے باکی، صاف گوئی، عزم و ہمّت اور قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر سب میں ممتاز نظر آتے تھے۔ کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام اور کرسچین مشنری سوسائٹی ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد، اس وقت جبکہ جناح ابھی سولہ سال ہی کے تھے، وہ گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی تربیت حاصل کرنے لندن روانہ ہو گئے۔

تاہم لندن پہنچ کر انہوں نے یہ تربیت حاصل کرنے کی بجائے وکیل بننے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا فیصلہ کیا اور اپنے طور پر لنکنز ان میں داخلہ لے لیا۔ تین برس بعد انہوں نے یہاں سے سند حاصل کی اور اس طرح سب سے کم عمر ہندوستانی بیرسٹر بن گئے۔

۱۸۹۶ء میں ہندوستان واپس آکر انہوں نے کراچی میں پریکٹس شروع کی۔ لیکن قانونی معرکہ آرائیوں کے لئے جو جوش اور ولولہ ان کی شخصیت میں موجود تھا اس کے لئے کراچی کی ماتحت عدالتوں کا ماحول نہایت محدود تھا۔ یقیناً ان دنوں بھی بلند نگاہی اور بلند حوصلگی ان کی شخصیت کا جوہر خاص تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں وہ بمبئی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اپنا نام ایک وکیل کی حیثیت سے درج کرایا اور اس طرح وہ بین الاقوامی نوعیت کے اس بڑے شہر میں اہم مسلمان بیرسٹر ہو گئے۔ بمبئی میں قیام کے ابتدائی تین سال اگرچہ جناح کے لئے سخت مشکلات کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے کیونکہ قانون کے میدان میں کامیاب و کامران ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا اس لئے اُن کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ انہیں چھوٹے موٹے مقدمات ملنے لگے۔ پھر تین برس بعد ۱۹۰۰ء میں چھٹیوں سے پیدا ہونے والی عارضی آسامی پر اُن کا تقرر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے ہوا۔ اس عارضی ملازمت کے دوران ہی اُن کے جوہر سب پر عیاں ہو گئے تھے۔ اس لئے مدت ملازمت کے خاتمے پر پندرہ سو روپے ماہانہ کی زیادہ تنخواہ پر انہیں ایک بڑے عہدے کی پیش کش کی گئی جسے قائداعظم نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اتنی رقم تو وہ صرف ایک دن میں کمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بار میں ان کی ترقی اور پیش رفت واقعی نہایت حیرت انگیز رہی۔ ۱۹۰۳ء تک ان کی آمدنی دو ہزار روپے ماہانہ ہو چکی تھی۔ اسی دوران میں انہوں نے

اپنے خاندان کے معاملات کو بھی منظم اور بہتر بنایا جو ان کی برطانیہ سے واپسی پر شدید مالی مشکلات سے دوچار تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جناح ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں پیروی کرنے لگے اور نہایت مختصر مدت میں وہ ہندوستان کے صف اوّل کے دیوانی اور فوجداری وکیل ہو گئے۔ اس کے کافی عرصے بعد جب وہ اس صدی کے چوتھے عشرے کے اوائل میں برطانیہ میں مقیم ہو گئے تھے تو انہوں نے پریوی کونسل کی عدالتی کمیٹی کے سامنے دلائل دینے کا اعزاز بھی حاصل کر لیا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے ہم پیشہ افراد میں انہیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بمبئی کے ایک نہایت قابل اور کامیاب وکیل نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا: ”مجھے نہیں معلوم وہ (جناح) یہ سب کیسے کر لیتے ہیں۔“ اس کے باوجود وہ محض دولت کی خاطر مقدمے نہیں لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایک مہاراجہ نے اُن سے اپنا مقدمہ لڑنے کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا: ”میں ایک وکیل ہوں، دلّال نہیں۔“

کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت کمزور مقدمے بھی جیت لیتے ہیں۔“

ایک بیرسٹر کی حیثیت سے جناح اپنی آزادیٔ رائے، جراٴت و بے باکی اور دیانت و ایمانداری کے لئے مشہور تھے۔ بمبئی کے ایک ممتاز وکیل سر چمن لال سیتل واڈ نے قائداعظم کے بارے میں کہا تھا: ”صورت حال کچھ بھی ہو وہ کبھی جج یا مخالف وکیل سے متاثر یا مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک وکیل کی حیثیت سے وہ عدالتوں کو مسحور اور مسخر کر دینے والی صلاحیتوں سے متصف تھے۔“ بحیثیت ایک مشیر انہوں نے کبھی بدترین حالات سے پریشان ہونا نہیں سیکھا تھا۔“ اور ہمیشہ اُن کا سر بلند رہتا تھا۔“

بمبئی کے ایک مؤقر ہفت روزہ کے ایڈیٹر جو کم ادلوانی نے ۱۹۴۰ء میں

قائداعظم کے بارے میں کہا تھا کہ انہوں نے بار میں اپنا عزّ و وقار ہمیشہ "قائم اور بے داغ" رکھا۔ وہ "بار کے اعلیٰ ترین معیار کی علامت تھے" اور "بار میں ان کی یاد ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے گی۔" یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر قائداعظم کو ہندوستانی بار کا "لارڈ سائمن" کہا جاتا ہے۔

سیاسی رجحان کا پس منظر

۱۹۰۵ تا ۱۹۱۰

اٹھارویں صدی میں مغربی تاجروں، تبلیغی جماعتوں اور نوآبادیاتی اقوام کی آمد کے ساتھ ہی جدید اور نئی ایجادات و ترقی کے ابتدائی اثرات نے بھی ہندوستان میں پیر جمانے شروع کر دیئے تھے۔ یہ نووارد اجنبی اپنے ساتھ تجارت، نوآبادیاتی یلغار اور مغربی راج کے ساتھ ہی نہ صرف جدید علوم، نئے تصورات اور افکار لائے بلکہ اپنے علم اور اپنے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے مغربی طریقے اور آلات بھی لائے۔ چنانچہ ۱۷۸۰ء تک چھپائی اور ٹائپ کی تیاری اور استعمال نے ہندوستان کے غیر سرکاری حلقوں میں مقبولیت اور توجہ حاصل کر لی۔ پہلے انگریزی اخبار کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر اگلے ساٹھ برس کے عرصے میں ہندوستانی بھی صحافت کے میدان میں داخل ہو گئے اور انہوں نے بنگالی، فارسی ہندی، گجراتی اور اردو جیسی کئی ہندوستانی زبانوں میں اخبارات نکالے۔ اسی دوران میں ہندوستان میں ایک سیاسی نظام بھی رائج ہو چکا تھا۔ ٹیلیگراف کی ایجاد ہندوستان پہنچ گئی تھی۔ پہلی ریلوے لائن بچھائی جا چکی تھی۔ یہ سب ایسے عوامل تھے جنہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کو طبعی طور پر باہم مربوط کر دیا تھا۔ ساتھ ہی کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے پریذیڈنسی شہروں میں کئی اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں

قائم ہو گئی تھیں اور یوں جدید طریقہ تعلیم کے ایک مرکزی ڈھانچے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان پر برطانوی راج قائم ہو چکا تھا جس کی بناء پر تعلیمی، انتظامی اور عدالتی سطح پر ملک کے متحد اور مربوط ہونے کا وہ عمل بھی مکمل ہو گیا جو گزشتہ کئی برسوں اور عشروں سے آہستہ خرامی سے جاری تھا۔ ان تمام عوامل نے بالآخر پرانے اور روایتی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھدی اور اس کے ملبے پر نئے نظام کی عمارت تعمیر کی۔ یوں ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان قرونِ وسطیٰ کے عہد سے عصرِ جدید میں داخل ہو گیا۔

نئے عہد کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ہندو تردد کے ساتھ سہی لیکن نفسیاتی طور پر تیار تھے۔ ۱۸۲۷ء میں راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ تا ۱۸۳۳ء) نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی جو اس سمت میں ایک اہم سنگ میل تھا۔ ان کے مقابلے میں مسلمانانِ ہند جو اپنی حکومت کے خاتمے پر مایوسی اور جھنجلاہٹ کا شکار تھے اور اسی بنا پر نہ صرف انگریزوں سے بلکہ ان کی جدید تعلیم کی طرف سے بھی بداعتمادی میں مبتلا تھے۔ نئے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآء ہونے کے لئے اس وقت بیدار ہوئے جب ۱۸۵۷ء کے بعد کے تاریک دور میں انہیں سنگین اور تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلامیانِ ہند کی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں سر سید احمد خان ان کے سب سے ممتاز اور اہم رہنما تھے۔ ان پر یہ حقیقت خوب اچھی طرح منکشف تھی کہ ہندوستان جس نئے عہد میں داخل ہوا چاہتا ہے اس کے مثبت پہلو اور تقاضے کیا ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے مسلمانوں کو مایوسی، بے حسی اور لاتعلقی کی اس کیفیت سے جو ان پر طاری تھی نکالنے کے لئے ایک کثیر جہتی پروگرام پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی انہوں نے مسلمان قوم کو قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے جدید عہد میں

داخل کردیا۔" ایک پسماندہ قوم کو انہوں نے "ترقی کی راہ پر گامزن کیا تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل ہو سکے۔"

یہ دور چونکہ مسلمانوں کی انتہائی پسماندگی کا دور تھا اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ۱۸۶۰ء کے بعد سے تعلیمی اور اقتصادی محاذ پر ان کی صف بندی کر کے انہیں منظم اور مضبوط بنایا جائے۔ انہیں کیونکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا سرخیل اور اصل سبب سمجھا جاتا تھا اس لئے انگریز ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ یہی وہ اسباب تھے کہ اس دور میں مسلمانوں کو سیاسی محاذ پر نہایت خاموش رہنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو قیامتِ صغریٰ ٹوٹی تھی اور جس نفسیاتی ہزیمت سے انہیں دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد اِس قوم کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کو از سرِ نو خود اعتمادی سے ہمکنار کرنے کے لئے یہی وہ دو بنیادی عوامل تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں نے سر سید احمد خان کے اصرار پر انڈین نیشنل کانگریس سے لاتعلقی اختیار کی، جو ۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز سرکاری ملازم سر آکٹیوین ہیوم نے قائم کی تھی۔

بہرحال اگلے بیس برس کے دوران حالات اور واقعات نے جو راہ اختیار کی اس کی بنا پر مسلمان اس فیصلے پر پہنچ گئے کہ اب ان کے لئے سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہنا ممکن نہیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے جائز حقوق یونہی پامال ہوتے رہیں گے۔ ۱۸۹۲ء کے انڈین کونسلز ایکٹ میں نمائندہ اداروں کے قیام اور بلاواسطہ انتخابات کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ دریں اثنا اسی دور میں کانگریس جہاں ایک اور آئینی پیش رفت پر زور دے رہی تھی، وہیں دوسری طرف اس نے مجوزہ اصلاحات کے تحت آئندہ قائم ہونے والی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی سے متعلق مسلمانوں کے نقطہ نظر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں کانگریس نے، جو اب بال گنگا دھر تلک (۱۸۵۶ تا ۱۹۲۰) کی قیادت میں انتہا پسند ہندو رہنماؤں کے زیرِ اثر آچکی تھی، نہ صرف مسلمانوں کو کئی معاملوں میں بالکل نظر انداز کر دیا تھا بلکہ ان کے حقوق کو بھی غصب کرنے کے درپے تھی۔ اس سلسلے میں کانگریس کا سب سے اہم اور بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ عدالتوں میں اردو کی بجائے ہندی رائج کی جائے۔

بال گنگا دھر تلک کے مسلم کش بیانات اور سرگرمیاں، یعنی عظیم مسلم رہنماؤں اور ممتاز مسلمان شخصیتوں کی تحقیر و تذلیل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ شیواجی کی پوجا، شیواجی کلبوں کا قیام اور گنیش کے تہوار کا آغاز وغیرہ سے ایسی فرقہ وارانہ تلخی اور کشیدگی پھیلی جس کے نتیجہ میں کئی مقامات پر ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔

مسلمانوں کے حوالے سے کانگریس نے جو روپ اختیار کیا تھا اس کے نتیجے میں تین مختلف لیکن باہم مربوط سطحوں پر واضح ردِعمل ہوا۔ اول یہ کہ مسلمانوں نے کانگریس سے قطعی لاتعلقی اختیار کر لی، ایسی لاتعلقی کا مظاہرہ انہوں نے اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۰ء میں جہاں کانگریس کے سیشن میں ۷۰۲ مندوبین میں سے ۱۵۶ مسلمان مندوبین نے شرکت کی تھی ۱۹۰۵ء کے سیشن میں ۷۵۶ مندوبین میں سے صرف ۱۷ مسلمان مندوبین شریک ہوئے۔ حالانکہ اس وقت سیشن کی صدارت گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ تا ۱۹۱۵) نے کی تھی جو اپنے لبرل نقطہ نظر اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی کی حیثیت سے بہت نیک نام تھے۔ دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمانوں نے آغا خان (۱۸۷۷ تا ۱۹۵۷) کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا جس نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وائسرائے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ

انتخابات اور علیحدہ نشتیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کا مقصد یہ تھا کہ کونسلوں میں مسلمانوں کے حقیقی اور صحیح نمائندے منتخب کئے جائیں تیسرا ردعمل یہ تھا کہ اس مطالبے کو انتہائی مؤثر انداز میں اور پوری قوت سے پیش کرنے، مجوزہ اصلاحات پر مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح اور دو ٹوک انداز میں سامنے لانے نیز مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کرنے کے لئے دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ابھی جب کہ مسلم لیگ کو ایک موثر طاقت اور حیثیت اختیار کرنے اور ہندوستانی سیاست میں مسلم انفرادیت کو مقصدیت اور ارتباط فراہم کرنے کے لئے ایک مدت درکار تھی، ۱۹۰۹ء کی مورلے منٹو اصلاحات میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ان اصلاحات سے لیجسلیٹو کونسل کے حقوق اور اس کے ارکان کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا اور ساتھ ہی براہِ راست انتخاب کا اصول بھی تسلیم کر لیا گیا تھا اگرچہ اس کی بنیاد محدود حق رائے دہی پر رکھی گئی تھی۔

اس مرحلے پر مسلم سیاست کے دھارے میں جو واحد مسلم رہنما نہایت نمایاں اور ممتاز انداز میں ابھر کر سامنے آئے۔ وہ جناح ہی تھے جنہوں نے ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں قدم رکھا تھا۔ اپنی عوامی زندگی کے آغاز پر اُس وقت جناح نے کانگریس سے جو وابستگی اختیار کی اس کی ایک نہایت معقول اور صاف وجہ بھی تھی۔ ہندوستان کے بیشتر طلبہ کی طرح انگلستان میں اپنے زمانۂ طالب علمی (۱۸۹۲ تا ۱۸۹۶) کے دوران جناح بھی ۱۹ویں صدی کے برطانوی لبرل ازم کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ وہ اس کے رہنماؤں اور مبلّغوں کا احترام کرتے تھے، اس کے اصولوں سے مخلص تھے اور اس کے اداروں سے نہایت گہرے طور پر گویا زندگی بھر کے لئے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں

برطانیہ میں ہندوستان کے ممتاز اور سرکردہ لبرل رہنما دادا بھائی نوروجی (۱۸۲۵ تا ۱۹۱۷) تھے۔ جنہیں برطانوی پارلیمنٹ کی ایک نشست پر منتخب ہونے کا منفرد اعزاز بھی حاصل تھا۔ جناح کی زندگی کے ابتدائی تشکیلی برسوں میں دادا بھائی نوروجی کا گہرا اثر تھا۔ وہی ان کے سیاسی استاد اور رہنما بھی تھے۔ اگلی دو دہائیوں میں کانگریس کے تین اور سرکردہ رہنماؤں کی وجہ سے لبرل ازم اور ارتقائی سیاست پر جناح کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ ان رہنماؤں میں گوکھلے، سر فیروز شاہ مہتا (۱۸۴۵ تا ۱۹۱۵) اور سر سریندر ناتھ بنرجی (۱۸۴۸ تا ۱۹۲۵) شامل ہیں۔ ان تمام رہنماؤں سے جناح کے گہرے تعلقات تھے۔

جناح کی زندگی اور شخصیت کی تشکیل میں تیسرا بڑا ہاتھ بمبئی کی عام فضا کا بھی تھا۔ اس بین الاقوامی شہر کی نیرنگیاں اور اس کی تجارتی فضا لبرل خیالات کے زیرِ اثر بھی تھی اور ان کا اظہار بھی۔ جناح اب اپنی زندگی کے تین عشرے گزار کر ۱۹۰۶ء کے اواخر میں چوتھے عشرے میں داخل ہو رہے تھے۔ بمبئی کا ماحول مسابقت اور مقابلے کا آئینہ دار تھا جہاں پارسیوں کی مختصر سی برادری تجارتی سطح پر فوقیت حاصل کر کے بقائے اصلح کی نمایاں مثال بن گئی تھی۔ عددی اقلیت، نسلی تعصب اور فرقہ وارانہ رکاوٹوں کے سامنے بمبئی کا بین الاقوامی معاشرتی ماحول، ہمتِ مرداں مددِ خدا، عزم و ہمت اور جدوجہد کی اہمیت کی زندہ مثال بھی تھا۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۳ء تک کے عرصے میں جناح کی ڈائریوں کے مندرجات اگرچہ کسی اعتبار سے بھی مکمل نہیں، تاہم ان میں ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ ان کے موکلوں میں پارسیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ لہٰذا اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ انہوں نے بعد میں رتن بائی سے شادی کی، تو یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی نامناسب نہیں کہ پارسیوں سے ان کے تعلقات صرف پیشہ وارانہ مصلحتوں

اور ضرورتوں تک ہی محدود نہیں تھے۔ چنانچہ اس فضا اور ماحول میں رہنے بسنے اور اس کا اثر قبول کرنے کے بعد اس وقت جناح اپنی ذاتی ترجیحات اور سیاسی نکر کے اعتبار سے بدرالدین طیب جی (۱۸۴۴ تا ۱۹۰۶) سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ جو خود ایک سرکردہ بیرسٹر، کانگریس کے سرکردہ سابق صدر، اور بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن کے اساسی رکن تھے۔ اس ایسوسی ایشن سے بعدازاں جناح نے بھی وابستگی اختیار کرلی۔ اس ماحول اور صورت حال میں اگر جناح نے سیاست میں داخل ہونے کے لئے کانگریس میں شمولیت اختیار کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ کانگریس بظاہر لبرل اصولوں کی بنیاد پر قائم تھی، وہ تمام فرقوں کے درمیان مساوات کا پرچار کرتی تھی اور اس نے ہندوستان کو آئینی طریقوں سے حکومتِ خوداختیاری کی راہ پر گامزن کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ کانگریس سے جناح کی پہلی رسمی وابستگی ستمبر ۱۹۰۵ء میں ہوئی جب بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن نے انہیں انگلستان جانے والے وفد میں مہتا کی جگہ کانگریسی وفد کا ایک رکن نامزد کیا۔ یہ وفد گوکھلے کی سربراہی میں اس لئے انگلستان بھیجا جا رہا تھا تاکہ وہاں حکومتِ خود اختیاری سے متعلق ہندوستانی عوام کی خواہشات کو نہایت موثر انداز میں اور معقولیت کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ سیاست میں یہ جناح کا پہلا قدم تھا۔ اس وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی نامزدگی ایک سیاسی ترجمان کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کی روشن مثال ہے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء تک جناح کانگریس میں اپنی پوزیشن مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں کانگریس کے صدر دادا بھائی نوروجی کا پرسنل سیکرٹری

نامزد کیا جاتا ہے۔ سیاست کی وادیٔ پرخار میں قدم رکھنے کے خواہش مند شخص کے لئے یہ ایک منفرد اعزاز تھا۔ عجب دلچسپ اتفاق ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کا تصور پہلی مرتبہ کلکتہ (۱۹۰۶) کانگریس میں پیش کیا گیا جس میں جناح نے اپنی پہلی سیاسی تقریر کی اور وہ بھی حکومتِ خود اختیاری کی قرارداد پر۔ دو برس بعد مدراس کانگریس میں انہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

دریں اثناء جناح کی اہمیت اور حیثیت بھی تسلیم کی جانے لگی تھی۔ جنوری ۱۹۰۷ء میں انہیں انڈین مسلمان ایسوسی ایشن کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اس کی داغ بیل کلکتہ میں ہونے والے ایک اجلاس میں ڈالی گئی تھی۔ یہ جماعت بھی کانگریس کی حامی تھی اور اس کے مقاصد میں دوسرے فرقوں کے تعاون سے ہندوستانی عوام کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے کام کرنا بھی شامل تھا۔ لیکن اس کا اصل مقصد مسلمانوں کے اہم مسائل کو حل کرنا، ان کی تشکیلات کے ازالے کی تدابیر کرنا اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ کم و بیش یہی وہ دور بھی ہے، جب انجمن ضیاء الاسلام سے بھی ان کی وابستگی گہری ہو گئی تھی۔ یہ انجمن شاید بمبئی میں مسلمانوں کی سب سے پہلی مذہبی اور سیاسی جماعت تھی۔

جناح فروری ۱۹۰۷ء میں اس انجمن کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ اس انتخاب کے دو برس بعد اگست ۱۹۰۹ء میں انجمن کے جلسۂ عام میں انہوں نے وہ اہم قرارداد پیش کی جس میں حکام سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر کونسل کے جو الیکشن ہونے والے ہیں، ان کے لئے مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے قیام کے سلسلے میں مسلم لیڈروں سے

صلاح مشورہ کیا جائے۔ یاد رہے کہ اس وقت جن مجوزہ اصلاحات کے نفاذ کا شہرہ تھا اس میں جداگانہ انتخابات کے اصول کو شامل کرنے کی بات عام ہو چکی تھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناح جداگانہ انتخابات کی وہ مخالفت ترک کر چکے تھے جو وہ ابتدا میں کرتے تھے۔

maablib.org

پارلیمانی دور

۱۹۱۰ تا ۱۹۴۷

۱۹۱۰ء سے جناح کی طویل پارلیمانی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب بمبئی کے مسلمانوں نے انہیں نو تشکیل امپیریل یجیسلیٹو کونسل کا رکن منتخب کیا جو ۱۹۰۹ء کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی تھی۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۷) تیسری دہائی کے اوائل میں (۱۹۲۰ تا ۱۹۲۳) اور چوتھی دہائی کے اوائل میں (۱۹۳۱ تا ۱۹۳۴) مختصر عرصوں کو چھوڑ کر، وہ مرکزی مجلس قانون ساز کے مستقل رکن رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی یہ مجلس توڑ دی گئی۔

ایک پارلیمنٹرین کی حیثیت سے صرف چند افراد ہی جناح کے ہم پلہ تھے۔ ان کی آزادئی فکر، دیانت داری، بحث و مباحثہ اور جدلیاتی صلاحیتیں، قوت استدلال، مسحور کن اندازِ خطابت اور بے پناہ حاضر جوابی اُن کے ایسے اوصاف تھے جن کی بنا پر وہ انتہائی قابلِ رشک اور نہایت قابلِ احترام ایسے رکن اسمبلی تھے جس کی دھاک ہر شخص پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے زمانے کے انتہائی سربرآوردہ پارلیمنٹرین بھی تھے۔ آزادانہ اندازِ فکر ان کی وہ خوبی اور وصف تھا جس کی بنا پر وہ کونسل میں اور اسمبلی چیمبر میں سب سے

نمایاں اور ممتاز نظر آتے تھے۔ اپنے اس اندازِ فکر سے کام لیتے ہوئے وہ کونسل کے سامنے پیش ہونے والے مسائل سے عہدہ براء ہوتے تھے۔ اسی خصوصیت نے انہیں یہ جوہرِ خاص بھی عطا کیا کہ وہ ہر اس اقدام کی دوٹوک حمایت کرتے تھے جو ہندوستان کے مفاد میں ہوتا (خواہ وہ سرکاری ممبروں کی طرف سے پیش کیا جاتا خواہ غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے) ساتھ ہی ساتھ وہ ہر اس اقدام کی کھل کر مخالفت بھی کرتے جو ان کے نزدیک ہندوستان کے مفادات کے منافی ہوتا۔ اس معاملے میں وہ یہ تخصیص بھی نہ کرتے کہ مذکورہ اقدام کا تعلق مسلمانوں سے ہے یا نہیں۔ غرض یہ کہ تمام ترقی پسندانہ اقدام کو اُن کی بھرپور اور بیباکانہ حمایت حاصل ہوتی۔ یوں دیکھا جائے تو کونسل کے رکن کی حیثیت سے ان کا پہلا دور نہایت متاثر کن اور قطعی بے داغ تھا۔ انہوں نے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستان کے کاز کی حمایت کی۔ (فروری ۱۹۱۰) پولی ٹیکنیک کالج کے قیام کی حمایت کی (مارچ ۱۹۱۰) ہندوستان میں پولیس ایڈمنسٹریشن کے معاملات کی تحقیقات کے لئے کمیٹی کے تقرر کی حمایت کی (۱۹۱۲) اور ہندوؤں میں شادی کے خصوصی ترمیمی بل کو منظور کرنے کی حمایت کی۔ (۱۹۱۱-۱۹۱۲) یہ بل بھوپندر ناتھ باسو نے پیش کیا تھا۔ علاوہ ازیں جناح نے گوکھلے کے بنیادی تعلیمی بل کی بھی حمایت کی (۱۹۱۲) ساتھ ہی ساتھ انہوں نے وقف علی الاولاد پر اپنا ایک بل بھی پیش کیا۔ کسی غیر سرکاری ممبر کا پیش کردہ یہ پہلا بل تھا جسے مجلس قانون ساز نے منظور کیا۔

اپنی اس معقولیت پسندی اور آزاد روش کی بنا پر وہ مختلف اقدامات کی ان کے اپنے محاسن کے مطابق حمایت یا مخالفت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سرکاری اقدامات پر ان کی تنقید یا مذمت محض مخالفت برائے

مخالفت یا بر بنائے مخاصمت نہ ہوتی کیونکہ وہ صرف ایسی پالیسیوں کی ہی مخالفت یا مذمّت کرتے تھے جو ہندوستان کے مفادات کے خلاف ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر قانونِ فوجداری کے ترمیمی بل (جو رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔) ۱۹۱۹ء کی نہایت شدومد سے مذمّت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "میں حکومت پر بے لاگ اور بے باکانہ تنقید کا قائل ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کا فرض ہے کہ جب حکومت صحیح راستے پر ہو تو اس کی حمایت اور اس سے تعاون کرے۔"

جناح نے اربابِ اختیار و اقتدار کے سامنے جھکنا اور دبنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب کبھی حالات کا تقاضہ ہوتا تو وہ انہیں للکارنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے۔ یہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے۔ وہ مجلسِ قانون ساز میں اگرچہ نئے نئے منتخب ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ایوان میں سینہ تان کر اور دبنگ انداز میں اپنا موقف پیش کرنے کا ایک اعلیٰ معیار پیش کیا۔ INDENTURED LABOUR FOR NATAL پر قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے جناح نے اُس ظالمانہ اور سخت رویے کے خلاف نہایت پر زور تقریر کی جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے روا رکھا جاتا تھا اور جس کی بنا پر ہندوستان کے تمام طبقوں کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے سلطنتِ برطانیہ کے ایک دوست حصّہ کے بارے میں لفظ ظالمانہ کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے جناح سے کہا کہ "وہ آدابِ مجلس کا لحاظ کرتے ہوئے الفاظ استعمال کریں۔" تو جناح نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا "مائی لارڈ! میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں لیکن میں اس ایوان کی ہیئت ترکیبی

سے بخوبی آگاہ ہوں اور اس کی حدود سے ایک لمحہ کے لئے بھی تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود میں پھر بالاصرار یہ کہوں گا کہ جو سلوک ہندوستانیوں سے کیا جاتا ہے وہ اتنا سنگین ہے کہ جس کا تصوّر بھی محال ہے اور جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس بارے میں اس پورے ملک کے احساسات یکساں ہیں۔"

ایک پارلیمنٹرین کی حیثیت سے جناح کی اوّلین کامیابیوں میں سے ایک کامیابی وقف علی الاولاد کے بل کی منظوری ہے۔ یہ بل خود انہوں نے مجلس قانون ساز میں پیش کیا تھا۔ مجلس کا اس بل پر غور کرنا ہی ان کی اس ذہانت اور فطانت کا مظاہرہ ہے کہ جس سے کام لے کر انہوں نے ایسے پیچیدہ اور متنازعہ بل کو منظور کرالیا۔ ساتھ ہی یہ کامیابی اس امر کی بھی دلیل ہے کہ وہ مسلم قوانین سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس بل پر انہوں نے دوسو الفاظ فی منٹ کی رفتار سے تقریر کی۔ (اپنے زورِ خطابت کا یہ مظاہرہ انہوں نے ہر اس موقع پر کیا جب مجلسِ قانون ساز دیگر قانونی موضوعات پر بحث کرتی تھی۔) دو برس کی انتھک سعی و کاوش کے بعد وقف علی الاولاد کے بل کو منظور کر لیا گیا۔ اپنے مخصوص آئینی اندازِ فکر کی بدولت جناح مجلسِ قانون ساز میں شہری حقوق کے تقدس کے سب سے بڑے اور سربرآوردہ علمبردار تھے۔ قانون فوجداری (ہنگامی اختیارات) کے بل پر جو رولٹ کمیٹی (۱۹۱۹) کی سفارشات پر مبنی تھا۔ ان کی تقریر اس ضمن میں ایک واضح مثال ہے۔ اس کا مقصد حکومتِ ہند کے ان اختیارات کی توسیع تھی جو اسے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۵ء کے تحت حاصل تھے اور جو جنگ کے بعد ختم ہونے والے تھے۔ جناح نے اس بل کی نہایت پُرزور اور بےلاگ مخالفت کی۔ پورے ملک کی طرف

سے بِل کی شدید مخالفت کے باوجود وائسرائے نے اس کی منظوری دے دی۔ چنانچہ جناح نے یہ کہتے ہوئے کونسل سے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا کہ جس انداز میں بل کی منظوری دی گئی ہے اس سے یہ امر اب بالکل واضح ہو گیا ہے کہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل صرف نام کے اعتبار سے تو قانون ساز ادارہ ہے لیکن درحقیقت یہ ایک ایسی مشین ہے جو ایک غیر ملکی ایگزیکیٹو کے ہاتھ کے اشارے پر چلتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس بِل کی منظوری سے انصاف کے بنیادی اصولوں کی بیخ کنی کی گئی ہے، اور آئینی حقوق کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔ یہ استعفیٰ جناح کی پارلیمانی زندگی کے پہلے دور کا تتمہ ہے۔

آئینی تقدس اور رکھ رکھاؤ کے لئے جناح کے جوش و جذبے اور شہری حقوق کے تقدس کے لیے ان کے احترام کی کوئی حد نہ تھی۔ ان امور کے سلسلے میں وہ کسی بھی رکاوٹ اور مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے اور نہ کسی سے امتیاز برتتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان معاملات میں ان کے مخالفین بھی کسی طرح سے متاثر ہوتے، وہ سینہ سپر ہو کر ان کی حمایت کے لئے میدان میں آ جاتے اور پھر وہ اتنی شد و مد سے ان کی حمایت کرتے جیسے خود ان کے کسی حامی یا پیروکار کو سزا دی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بغیر مقدمہ چلائے ولبھ بھائی پٹیل کی گرفتاری (۱۹۳۰) اور سرت چندر بوس کی گرفتاری (۱۹۳۵) پر اسی طرح شد و مد سے بے دریغ احتجاج کیا جس طرح انہوں نے علی برادران کی گرفتاری (۱۹۱۴) اور مسز اینی بسنت کی گرفتاری (۱۹۱۷) کی مزاحمت اور مخالفت کی تھی۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت یقیناً عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا اندازِ فکر کتنا آزادانہ تھا۔ اصولوں کی پاسداری میں وہ کس جرأت سے کام لیتے تھے، قانون کا

کس قدر احترام کرتے تھے اور جب کبھی آئینی یا شہری حقوق کو پامال کیا جاتا تو اس پر وہ کس طرح چراغ پا ہو جاتے تھے۔ ان کی اس جرأت اور بے باکی کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ ہمیشہ حق کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایسا روشن پہلو ہے جس کی تصدیق اور اعتراف اُن کے سیاسی حریفوں نے بھی اکثر کیا ہے۔

ان تمام خوبیوں کی وجہ سے اسمبلی چیمبر کے اندر اور باہر ان کے بہت سے مداح پیدا ہو گئے تھے۔ ان مداحوں میں جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو (۱۸۶۱ تا ۱۹۳۱) بھی شامل تھے۔ اس صدی کے چوتھے عشرے کے آواخر میں وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ایک رکن سر فریڈرک انسٹ جیمز نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ "میں جناح کی منفرد پارلیمانی خوبیوں کا بڑا مداح ہوں، سیاست کے رمز شناس کی حیثیت سے ان کا ثانی تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔"

ان کی اس طویل پارلیمانی زندگی کا عظیم ترین اور تابناک لمحہ اگست ۱۹۴۷ء میں آنے والا تھا، جب پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے متفقہ طور پر انہیں اپنا پہلا صدر منتخب کیا۔

جناح، کانگریس اور مسلم لیگ

۱۹۰۶ تا ۱۹۲۰

جناح اگرچہ شروع میں کٹر کانگریسی تھے، اس کے باوجود مسلمانوں میں وہ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے جناح کو انجمن ضیاء الاسلام کی مجلسِ عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ (۱۹۰۷) اسی بنا پر بمبئی کے مسلمانوں نے امپیریل لیجیسلیٹو کونسل میں انہیں اپنی نمائندگی کا مستحق سمجھا۔ (۱۹۱۰) اور یہی سبب ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا رکن نہ ہونے کے باوجود مسلسل تین برس (۱۹۱۰ تا ۱۹۱۲) ان کو کونسل کے اجلاس کی کارروائی میں شرکت اور خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے لیگ کو بہت گہرے طور پر متاثر کیا۔ کیونکہ مسلم لیگ کونسل اجلاس (۱۹۱۲) میں کئے جانے والے دو اہم فیصلے ایسے تھے جن میں بڑی حد تک ان کا ہاتھ تھا۔ ان میں سے ایک فیصلہ مسلم لیگ کے دستورِ اساسی پر نظرثانی سے متعلق تھا اور دوسرا ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کرنے سے متعلق۔ پھر مارچ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کر کے حکومتِ خوداختیاری کے حصول (آئینی طریقوں سے) کو اپنا مقصدِ وحید قرار دیا اور یہ وہ مقصد اور منزل تھی جو جناح کو بے حد عزیز تھی۔

انہوں نے مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ تا ۱۹۳۱) اور لیگ کے جنرل سیکرٹری

سروزیر حسن کے اصرار پر ستمبر ۱۹۱۳ء میں باضابطہ طور پر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ لیگ کے یہ دونوں رہنما اس وقت مسجد کانپور کے واقعے کے سلسلے میں انگلستان میں تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ جناح نے ۱۹۱۱ء میں مجلس قانون ساز میں وقف علی الاولاد کے مسئلے پر ایک بل پیش کیا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث تھا۔ مسلمانوں کے وقف قوانین میں برطانوی حکمرانوں کی مداخلت کا آغاز ۱۸۷۳ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے سے ہوا تھا جس کی انتہا ۱۸۹۴ء میں اس وقت ہوئی جب پریوی کونسل نے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس فیصلے کی رو سے مسلمانوں کو اپنے اہل خاندان اور اولاد کے نام قانونی وقف بنانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس فیصلے کی وجہ سے اب نہ صرف مسلم قوانین قابل بحث بن گئے تھے بلکہ بہت سے قدیم مسلمان خاندان اس کی وجہ سے تباہی اور غربت اور افلاس سے دوچار ہو گئے تھے۔ یہی وہ اسباب تھے کہ مسلم ہندوستان کی وہ سیاسی قیادت جس کی تربیت مغربی انداز میں ہوئی تھی، اس فیصلے کو مسلم شرفاء کے اقتصادی استحکام پر ایک ضرب کاری سمجھتی تھی۔ اس فیصلے کے خلاف مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر احتجاج کیے۔ اس کا آغاز سرسید احمد خان نے کیا تھا۔ پریوی کونسل کے فیصلے سے مرتب ہونے والے تباہ کن اثرات پر مسلمانوں کی برہمی اور تشویش بجا تھی۔ اس برہمی اور تشویش کی بازگشت ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء کے دوران مسلم لیگ کی منظور کردہ کئی قراردادوں میں سنائی دی۔ دہلی میں مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۱۰ء) میں حکیم اجمل خان (۱۸۶۳ء تا ۱۹۲۷ء) کے خطبۂ استقبالیہ، آغا خان کی افتتاحی تقریر اور سید امیر علی (۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء) کی تقریر میں بھی انہی تباہ کن اثرات کی گونج

تھی۔ یہی موضوع ندوۃ العلماء کی یادداشت اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی مسلم انجمنوں کی ان سیکڑوں یادداشتوں کا تھا جو انجمن وقف علی الاولاد کے سیکرٹری مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴) کی اپیل پر حکومت کو بھیجی گئی تھیں۔

یہ حقیقت کہ کلکتہ (۱۹۰۶) کانگریس میں جناح کی پہلی تقریر کا موضوع بھی یہی مسئلہ تھا، بذاتِ خود اس امر کی تصدیق ہے کہ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز پر بھی جناح کو مسلمانوں کے مسائل سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ مسلم لیگ نے اس موضوع پر بِل پیش کرنے کے لئے کسی اور مسلم کونسلر سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ بلکہ صرف محمد علی جناح ہی کو یہ فرض سونپا گیا تھا۔ اس معاملے میں لیگ نے انہیں دوسروں پر جو فوقیت اور ترجیح دی اس سے بھی اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس وقت مجلس قانون ساز کے مسلمان اراکین میں وہ سب سے ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس بل کے سلسلے میں جناح نے جس مساعیٔ جلیلہ سے کام لیا اسے نہ صرف مختلف مسلم اخبارات نے سراہا بلکہ مسلمانوں نے بھی متاثر ہو کر جناح کے بل کی حمایت میں یادداشتیں بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ نتیجتہً عوام کے ذہنوں میں جناح کی ذات اسی بل کے حوالے سے محفوظ ہو گئی اور وہ بھی اس انداز میں کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ باسو کے شادی کے خصوصی ترمیمی بل (۱۹۱۱ - ۱۹۱۲) پر ان کے اختیار کردہ موقف کی بنا پر اُن کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، جناح ۱۹۱۳ء میں خود کو دوبارہ انتخاب کے لئے پیش نہیں کریں گے، تو اس بل کے انجام کے بارے میں اسلامیانِ ہند سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے حکومت پر زور دیا کہ جناح کو ایک اور مدت کے لئے امپریل کونسل کا رکن نامزد کیا جائے تاکہ جب یہ بل سلیکٹ کمیٹی سے واپس آئے تو وہ کونسل میں

اسے کامیابی سے پیش کر سکیں اور ہوا بھی یہی، انہیں کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔

وقف بِل پر جناح کی دو تقریریں جہاں ان کی دوسری خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں وہیں اس امر کی بھی غمّاز ہیں کہ وہ اس موضوع پر مسلم نقطۂ نظر کے تمام پہلوؤں سے نہ صرف گہری واقفیت رکھتے تھے (جس میں مسلم لیگ اور ندوۃ العلماء کا نقطۂ نظر بھی شامل ہے۔) بلکہ انہیں مسلمانوں کی عام معاشی اور اقتصادی حالت پر بھی گہری تشویش اور پریشانی تھی۔ جناح کی یہ تقریریں اس بات کی بھی مظہر ہیں کہ وہ مسلم قوانین پر کتنا عبور رکھتے تھے اور ان کے دل میں مسلم قوانین کے لئے کتنا احترام تھا۔ اس احترام و عقیدت کا مظاہرہ انہوں نے اس بل کی دوسری خواندگی پر کیا۔ بنیادی طور پر وہ تمام اوقاف کی رجسٹریشن کے حامی تھے اور اس کی وہ نہایت مؤثر اور مدلل انداز میں وکالت بھی کر چکے تھے لیکن بعد میں مسلم قوانین اور مسلم رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے وہ نہ صرف زبانی اوقاف کے بھی حامی ہو گئے بلکہ اس کی کھل کر حمایت بھی کی۔ اس بل کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ایسی کوئی شئی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جس سے کسی بھی طور سے مسلمانوں کے پرسنل لا کو متاثر یا منسوخ کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہو۔"

اس تمام پس منظر اور تناظر میں دیکھا جائے تو پہلا وقف ایکٹ (۱۹۱۳ء) دو اعتبار سے نہایت اہم تھا۔ اوّل یہ کہ اس کی بنا پر مسلمانوں کے دلوں میں جناح کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا اور دوم یہ کہ اس بل کی بنیاد پر ہندوستان میں مسلم قوانین کی تشکیل کی طرف پیش رفت ہوئی۔ جناح نے جس تدبر کی اور ہوشیاری کے ساتھ "ایک پیچیدہ اور متنازعہ" بل کونسل میں پیش کیا اور اسے منظور کرایا۔ اس کے بارے میں سر وجئی نائیڈو کا کہنا ہے کہ اس بل کے نتیجے میں ہندوستان بھر میں انہیں

اپنے ہم مذہبوں میں پہلی مرتبہ عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں تک ہندوستان میں مسلم قانون کی پیش رفت کا تعلق ہے تو ایک اہل الرائے شخص کے بقول یہ بل "بعد میں اوقاف سے متعلق بننے والے بہت سے قوانین کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔" علاوہ ازیں اس بل سے بہت سے ایسے موضوعات پر بھی جن کا اوقاف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نئی قانون سازی کے لئے دروازہ کھل گیا۔ (طیب جی صفحہ ۱۹۶، ۱۹۷) یوں مسلم قانون سازی میں پیش رفت ہوئی۔ یہ بل جناح کا ایک ایسا کارنامہ تھا جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

۱۹۱۳ء۔ ۱۹۱۴ء کا عرصہ جناح کی سیاسی زندگی کے پہلے دور (۱۹۰۵ تا ۱۹۲۰) کا درمیانی حصہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب کانگریس کے معاملات سے جناح کی وابستگی بہت گہری ہو گئی تھی۔ ان مصروفیات کے باوجود بھی وہ مسلمانوں کی طرف سے غافل نہیں رہے اور نہ انہوں نے مسلمانوں کے مخصوص "کاز" یا ان کے خصوصی مفادات کی طرف سے لاتعلقی اختیار کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اپنے لبرل پس منظر اور اندازِ فکر کی بنا پر شاید وہ ترقی اور حکومتِ خوداختیاری کی سمت ملک کی پیش قدمی میں مسلمانوں کو، جو آبادی کا ایک بڑا حصہ تھے، نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس دور کے دیگر کئی مسلم رہنماؤں کی طرح وہ بھی اسی خیال کے حامی تھے کہ وہ ہندوستان کے نیشنلسٹ کاز کو آگے بڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہندوستانی قوم میں شامل تمام دیگر اکائیوں کے کاز کو بھی آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہی وہ یقین اور اندازِ فکر تھا جس نے مثال کے طور پر مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ تا ۱۹۳۱) مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۸ تا ۱۹۵۱) ڈاکٹر مختار انصاری (۱۸۸۰ تا ۱۹۳۶) ڈاکٹر مظہر الحق (۱۸۶۶ تا ۱۹۲۹)، سید علی امام (۱۸۶۹ تا ۱۹۳۲)، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۱۸۸۴ تا ۱۹۶۳) اور اس عہد کے متعدد دوسرے رہنماؤں کو

ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کے جذبے سے سرشار کر رکھا تھا۔ ان لیڈروں کے ساتھ جناح کو یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد ایک لازمی امر ہے۔ بلاشبہ، یہ حقیقت کہ جناح نے ہندوستانی اتحاد کے لئے نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ جناح شروع ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان کے جسدِ سیاسی میں دو بڑے فریقوں میں ایک سمجھتے تھے۔

جیساکہ مندرجہ بالا سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کے وقت ہی سے جناح نے مسلمانوں کے امور میں گہری دلچسپی لی تھی۔ کلکتہ (۱۹۰۶) کانگریس میں انہوں نے جو دو تقریریں کیں وہ براہِ راست مسلمانوں ہی کے متعلق تھیں جبکہ ان کی پہلی تقریر وقف علی الاولاد کے بارے میں قرارداد کی حمایت میں تھی۔ ان دیگر دو تقریروں میں سے ایک تقریر مقابلے کے امتحانوں کے بارے میں چوہدری کی قرارداد کی مخالفت میں تھی۔ جس میں دیگر امور کے علاوہ مسلمانوں کو ایک پسماندہ طبقہ قرار دے دیا گیا تھا اور اس بناء پر ان کے لئے مناسب مراعات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جناح کا موقف یہ تھا کہ مسلمان برادری کو ایک پسماندہ طبقہ متصوّر کرنا ان کے نزدیک مسلمانوں کی تضحیک ہے۔ مزید یہ کہ مسلمان کسی طور بھی ہندوؤں سے کمتر نہیں بلکہ ہر اعتبار سے ان کے ہم پلّہ اور برابر ہیں۔ ہندو مسلم برابری کے اس اصول کا قدرتی نتیجہ یہی ظاہر ہونا تھا کہ ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری کے کسی بھی انتظام میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو یکساں اقتدار ملنا چاہیئے۔ جناح ہندوستانی نیشنلزم کا یہی لبرل نقطۂ نظر رکھتے تھے جس سے اس امر کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں وہ جداگانہ انتخابات کیلئے مسلمانوں کے مطالبہ کی کیوں مخالفت کرتے تھے۔ ظاہر

ہے انہوں نے یہی سوچا ہوگا کہ اگر واقعی کانگریس ہندو مسلم سیاسی مساوات پر یقین رکھتی ہے اور دوسری طرف نوروجی، گوکھلے، مہتا اور بینرجی جیسے کانگریس کے سربرآوردہ رہنما بھی یہی تاثر دے رہے ہیں، اور اگر کانگریس اس امر کی بھی قائل ہے کہ عہد آزادی میں مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ اقتدار میں برابر کے شریک ہوں گے تو پھر تمام مسائل بھی مصالحت کے جذبے کے علاوہ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر حل کر لئے جائیں گے۔ اسی بناء پر ان کے نزدیک مسلمانوں کے اس خدشے کا بھی کوئی جواز نہ تھا کہ ہندو اپنی "بے رحم اکثریت" کے بل بوتے پر انکو اپنے ووٹوں سے اپنا غلام بنا لینگے۔ ایسی صورت میں وہ ایک علیحدہ مسلم مملکت کو آئینی اور قانونی طور پر تسلیم کرانے کی بھلا کیا ضرورت محسوس کرتے۔

انہی دلائل و براہین نے ابتدائی طور پر جناح کو جداگانہ انتخابات سے متعلق مسلمانوں کے مطالبے کی مخالفت پر مائل کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں جب جناح امپریل کونسل کے رکن منتخب ہوئے تو اس کے بعد ہی انہیں مسلمانوں کے مسائل کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی وہ شمالی ہند میں مسلم رائے عامہ کے قومی دھارے سے بھی قریب آ گئے۔ ندوہ، علیگڑھ اور مسلم لیگ سے ان کے روابط گہرے ہوئے اور اس کے بعد مسلم مسائل سے متعلق ان کے انداز فکر میں بتدریج تبدیلی آتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت بھی ان پر عیاں ہوتی گئی اور وہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ بہر طور مسلمانوں کے بعض مخصوص مفادات اور بعض ضروریات ایسی ہیں جن کے تحفظ اور تسکین کی اشد ضرورت ہے بشرطیکہ ان کو سمجھنے میں خلوص کارفرما ہو اور مقصد مسلمانوں کو پیچھے چھوڑنا یا نظر انداز کرنا نہ ہو۔ ان میں سے ایک اہم ضرورت بلاشبہ جداگانہ انتخابات کا برقرار رکھا

جاتا تھا جس کی گنجائش انگریزوں نے ۱۹۰۹ء کے ایکٹ میں فراہم کی تھی۔ چنانچہ آگرہ لیگ سیشن (دسمبر ۱۹۱۳) میں جناح نے بلدیاتی اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کو برقرار رکھنے کے مطالبہ پر یعنی قرارداد کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ جداگانہ انتخابات کے مسئلہ پر ان کی مخالفت رفتہ رفتہ کمزور پڑ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء تک پہنچتے پہنچتے وہ مسلمانوں کے اس دعوے کی صداقت کے اور زیادہ معترف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ جداگانہ انتخابات کے مطالبے پر اب مزید بات چیت یا بحث و تمحیص بے کار یا بے سود ہے۔ کیونکہ یہ پوری مسلمان برادری کا فیصلہ اور مسلمانوں کی ضرورت کا تقاضا ہے" چنانچہ اس مطالبے کی مخالفت ترک کر دینی چاہیئے۔

۱۹۱۴ء تک جناح، جنہوں نے گزشتہ برسوں میں کانگریس میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا، مسلمانوں اور مسلم لیگ کا اعتماد بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح اب وہ جہاں کانگریس اور لیگ کے درمیان پل بن گئے تھے وہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی رابطہ کا کردار ادا کر کے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ رابطے کے اس کردار کی تکمیل اور ہندو مسلم اتحاد کو حقیقت بنانے کے لئے جناح نے اس وقت کی فضا میں گھلے ہوئے تمام تر شکوک و شبہات اور جہاں دیدہ افراد کی سخت مخالفت کے باوجود، اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے لیگ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنا آئندہ اجلاس اسی مقام اور وقت پر منعقد کرے جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ان کی اسی تگ و دو کے نتیجے میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس یکے بعد دیگرے ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے مقام پر منعقد

ہوئے۔ ان اجتماعات میں انہوں نے آئینی اصلاحات کے لئے کانگریس اور لیگ کی متفقہ اسکیم تیار کرنے کی تجویز پیش کی۔ مجوزہ اسکیم کی تیاری کے لئے جناح نے زبردست دوڑ دھوپ کی۔ ان کی یہ جدوجہد ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ پر منتج ہوئی۔ ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کی نمائندگی کرنے والی ان دو جماعتوں کے درمیان یہ واحد سمجھوتہ ہے جو کسی دور میں ہوا۔ اس سے قبل جناح امپیریل کونسل کے ۲۷ منتخب اراکین میں سے ۱۹ کی حمایت سے میثاقِ لکھنؤ سے ملتی جلتی تجاویز پر مشتمل ایک یادداشت بھی وائسرائے کو پیش کر چکے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد جب اصلاحات کی دوسری قسط تیار کرنے کا مرحلہ آیا تو ان تجاویز کو نظرانداز نہ کیا جاسکا، جن کی حمایت ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے علاوہ کونسل کے منتخب اراکین نے بھی کی تھی۔ چنانچہ یہ تجاویز مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی بنیاد بنیں جنہیں ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایکٹ میں ان تجاویز کی شمولیت دراصل جناح کی فتح تھی۔ ان کی بے لوث اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔

ان تناظر میں میثاقِ لکھنؤ ہندوستانی اور مسلم سیاست کے ارتقا میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اولاً اسی میثاق میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات، اور مجلسِ قانون میں ان کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کا حق تسلیم کیا گیا۔ ساتھ ہی مرکز اور اقلیتی صوبوں میں نمائندگی کا اصول بھی طے پا گیا۔ ثانیاً، کانگریس جو اب تک جداگانہ انتخابات کی شدومد سے مخالفت کرتی رہی تھی اس نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا اور اسے کانگریس لیگ مشترکہ اسکیم میں شامل کرکے یہ اسکیم سیکرٹری آف اسٹیٹ کو پیش کر دی

تاکہ اسے اصلاحات کی اگلی قسط میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح جناح کے لئے اب وہ موقعہ آ گیا تھا کہ وہ کسی تنازع کے بغیر جداگانہ مسلم نمائندگی کا مسئلہ اٹھائیں اور ۱۹۱۹ء کے ایکٹ میں اسے برقرار رکھنے کی راہ ہموار کریں۔ یوں دیکھا جائے تو میثاقِ لکھنؤ آئینی سطح پر ہندوستان کے جسدِ سیاست میں جداگانہ مسلم تشخص کو تسلیم کر لینے کا براہِ راست سبب بنا۔ ثانیاً، عام انتخابی حلقوں میں مسلمانوں کو ووٹ اضافی دینے کا جو حق حاصل تھا وہ بھی واپس لے لیا گیا۔ یہ بات بھی دونوں فرقوں کے باہمی امتیاز اور فرق کو اجاگر کرنے کا سبب بنی۔ ثالثاً دوہرے ووٹ کی شق جو میثاقِ لکھنؤ میں شامل تھی۔ دراصل اس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا گیا کہ وہ ایک کثیر القومی ملک میں ایک جداگانہ قومی گروپ ہیں اور بقول آغا خان "ایک قوم کے اندر علیحدہ قوم ہیں۔"، خامستہ میثاقِ لکھنؤ اس بات کا بھی واضح اعلان تھا کہ مسلم لیگ، مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس طرح میثاق کی مختلف شقیں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہندوستانی سیاست میں مسلم انفرادیت کو تسلیم کرانے کی سمت ایک مؤثر رجحان ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کی طرف سے میثاقِ لکھنؤ کے معمار کی حیثیت سے جناح نے گویا اس دور میں آئینی سطح پر قومی تشخص کے لئے مسلم جدوجہد کو نتیجہ خیز بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۱۷ء تک ہندو اور مسلمان دونوں جناح کو ہندوستان کے انتہائی ممتاز اور نمایاں سیاسی رہنما کی حیثیت سے تسلیم کر چکے تھے۔ انہیں صرف کانگریس اور امپیریل کونسل میں ہی ایک ممتاز حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ وہ مسلم لیگ میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے اور ہوم رول لیگ کی بمبئی شاخ کے صدر بھی تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ لکھنؤ میں کانگریس اور

لیگ کے درمیان مفاہمت کرانے کے لئے جناح نے جو مرکزی کردار ادا کیا تھا، اس کی بنا پر اب وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر ہی نہیں رہے تھے بلکہ وہ اس اتحاد کی زندہ علامت بھی بن گئے تھے۔

آنے والے برسوں میں جب ہندوستان کی سیاست میں تشدد کا عنصر داخل ہوا تو جناح کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ کیونکہ "نظم و ضبط کے ساتھ پیش قدمی، میانہ روی، تدریجیت اور آئینی رکھ رکھاؤ کے داعی تھے۔ اس لئے وہ شدت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ سیاسی دہشت پسندی قومی آزادی کی شاہراہ کبھی نہیں بن سکتی۔ البتہ تباہی اور نراجکی کا غار ضرور ثابت ہو سکتی ہے۔ شاید یہی وہ اندازِ فکر تھا جس کی بنا پر جناح جیسے اصول پرست، تعمیر پسند اور آئینی جدوجہد پر یقین رکھنے والے شخص کے لئے موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ تا ۱۹۴۸) کے اس پروگرام کو پسند کرنا یا اس کی تائید کرنا، ممکن نہ تھا۔ جو ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کے علاوہ سرکاری امداد سے چلنے والے اسکولوں اور کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں اور برطانوی ٹیکسٹائل کے سہ طرفہ بائیکاٹ کے انوکھے طریقوں پر مشتمل تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی نے ہوم رول لیگ کا صدر منتخب ہو کر اس کا دستور اور نام تبدیل کرنا چاہا تو جناح نے یہ کہہ کر ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔۔ "آپ کے انتہا پسندانہ پروگرام نے وقتی طور پر، زیادہ تر ناتجربے کار نوجوانوں، جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو اپنے زیرِ اثر لیا ہے۔ اس کا حاصل صرف بدنظمی اور انتشار ہوگا۔"

جناح جتنی اہمیت منزل کو دیتے تھے اتنی ہی اہمیت اس منزل تک پہنچنے کے ذرائع کو بھی دیتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوآبادیاتی راج سے

عوام کو نجات دلانے کے لئے جناح "ذرائع" کو پسند کرتے تھے اور اس کے قائل بھی تھے لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ منزل تک پہنچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں ان کے جواز کا تعین ذرائع کرتے ہیں اگرچہ غیر ملکی آقاؤں کی غلامی سے ہندوستانیوں کی مایوسی اور بددلی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور اس بنا پر انتہا پسندی کے تمام اسباب موجود تھے، اس کے باوجود جناح کے خیال میں گاندھی کا فلسفۂ عدم تعاون ہندوستانی عوام کی اسی ناامیدی، مایوسی اور منفی رجحان کی انتہا تھی۔ اس کے نتیجے میں بے چینی اور اشتعال میں اضافہ تو ہو سکتا تھا لیکن اس سے کوئی تعمیری نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے گاندھی کی ان پالیسیوں کی نہایت سختی اور پوری توانائیوں کے ساتھ مخالفت کی۔ ساتھ ہی تیسری دہائی کے اوائل میں خلافت اور پنجاب کی تحریکوں سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں انہیں درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ناگ پور (۱۹۲۰) کانگریس سیشن میں گاندھی کے اس پروگرام کی منظوری کے موقع پر جناح نے واضح الفاظ میں خبردار کیا: "آپ لوگ ایک ایسا (ایک سال میں سوراج کا قیام) اعلان کر رہے ہیں اور انڈین نیشنل کانگریس پر ایک ایسا پروگرام ٹھونس رہے ہیں جسے آپ کبھی بروئے کار نہیں لاسکیں گے۔" ان کا خیال تھا کہ آزادی کی راہ کبھی مختصر نہیں ہوتی۔ اس لئے گاندھی آئینی حدود سے متجاوز جو طریقے اختیار کر رہے ہیں وہ ہندوستان کو سیاسی دہشت گردی، لاقانونیت اور انتشار کی طرف تو لے جا سکتے ہیں، اسے آزادی کی دہلیز کے قریب نہیں لے جا سکتے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کی ہیجان خیز فضا میں، جبکہ جذبات بھڑکے ہوئے تھے، جناح کے یہ تمام مشورے اور دلائل بے کار گئے، ان پر کسی نے کان نہ

دھرا اور کانگریس آئینی جدوجہد کی راہ ترک کر دینے پر تل گئی۔ اس کے ساتھ ہی جناح کے اُس سیاسی پروگرام کے تار و پود بھی چشم زدن میں بکھر گئے جس کے لئے وہ کم و بیش ایک عشرے پر محیط عرصے سے نہایت جانفشانی، سرگرمی اور خلوص کے ساتھ شب و روز جدوجہد کرتے رہے تھے۔ جناح کے اس سیاسی پروگرام کا مقصد ہندوستان کو قدم بہ قدم حکومتِ خود اختیاری کے لئے تیار کرنا، اور آئینی طریقوں اور قانون سازی کی تعمیری کوششوں کے ذریعے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلانا تھا۔ علاوہ ازیں کانگریس نے گاندھی کی سحر طراز شخصیت کے زیرِ اثر عوامی سیاست کو اپنا لیا تھا، جبکہ مزاج اور تربیت دونوں اعتبار سے سڑکوں کی احتجاجی سیاست میں کم از کم اس وقت تک جناح کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء کے عرصے میں قومی قیادت کم و بیش ان کی گرفت میں تھی۔ اس عرصے میں وہ کانگریس کی ایک مقبول شخصیت بن چکے تھے لیکن اب گاندھی کے مقابلے میں وہ اس حیثیت سے محروم ہو گئے تھے۔ جب کہ دوسری طرف گاندھی کو اب "مہاتما" کا لقب اور نئے عہد کے دیوتا کا روپ دیا جا رہا تھا اور یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی سیاسی جسارت و جرأت کے ساتھ ایسے فسوں کار ہیں جو ایک برس کے اندر نہ صرف ہندوستان کو آزادی دلا دیں گے بلکہ یہاں سوراج بھی قائم کر دیں گے۔" اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جناح نے ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ جس کے ساتھ ہی گویا یہ طے ہو گیا کہ نیشنلسٹ سیاست میں اب ایک نیا رجحان آچکا ہے۔ گاندھی کی فتح اور عروج کے ساتھ ہی جناح کے اثر و رسوخ میں کمی اور ہندوستانی سیاست پر ان کی گرفت کمزور ہونے سے جو نیا رجحان پیدا ہوا تھا وہ سب سے پہلے کلکتہ (۴ تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰) کی خصوصی کانگریس میں ابھر کر سامنے آیا۔ یہاں عدم

تعاون کے بارے میں گاندھی کی قرارداد پہلے سبجیکٹ کمیٹی میں سات ووٹوں کی معمولی اکثریت سے منظور ہوئی اور پھر کھلے اجلاس میں ۸۸۴ کے مقابلے میں ۱۸۸۶ ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ بعد ازاں ناگ پور (دسمبر ۱۹۲۰) کانگریس کے اجلاس میں جہاں عدم تعاون کے پروگرام پر حتمی مباحثہ ہوا اور اس پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا۔ جناح نے اس پروگرام کی مخالفت میں آخری کوشش کی لیکن مندوبین نے شور و غوغا مچا کر ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس اجلاس کے نتیجہ میں ابھرتی ہوئی نئی صورتِ حال قطعی شکل میں سامنے آ گئی اور اس نے حتمی طور پر جناح سمیت کانگریس کے تمام سرکردہ دوسرے رہنماؤں اور گاندھی کے درمیان قیادت کی رسی کشی کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا۔ اس ضمن میں گاندھی کے ایک دیرینہ مداح سیتارامیہ کا کہنا ہے۔ "یہ اجلاس گاندھی کے لئے ایک ذاتی فتح ثابت ہوا۔۔۔ پال، مالویہ اور جناح اور کھپارڈے جیسے تجربہ کار افراد اور داس اور لال جی جیسے سرکردہ سیاستدان بہ آسانی مغلوب ہو گئے۔"

اس طرح ناگ پور جناح کی سیاسی زندگی میں نہ صرف ایک اہم موڑ ثابت ہوا بلکہ یہاں ان تمام کوششوں پر بھی پانی پھر گیا جو جناح اب تک کرتے چلے آئے تھے۔ یہ صورتِ حال اس بات کا اشارہ تھی کہ اب اسی کانگریس سے ان کی علیحدگی یقینی ہو گئی ہے جس کے پلیٹ فارم سے چودہ برس قبل انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا جس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے خود کو اس حد تک وقف کر دیا تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کی ناپسندیدگی تک مول لے لی۔ جس کے لئے ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ اس سے ایک برادرانہ سمجھوتہ کر لے اور اس خواہش کو عملی صورت دینے کے لئے انہوں نے جدوجہد کی اور میثاق لکھنؤ (۱۹۱۶ء) کی صورت میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ مگر اب حالات نے جو کروٹ

لی تھی اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جناح سمیت تمام اعتدال پسند اور میانہ رو رہنما گاندھی کے مقابلے میں شکست کھا چکے تھے اور گاندھی وہی شخص تھا جنوبی افریقہ میں جس کے کاز اور موقف کی پرزور تائید اور حمایت کرتے ہوئے امپیریل کونسل کے اجلاس ۱۹۱۰ء میں جناح اور وائسرائے کے درمیان پہلی جھڑپ ہوئی تھی۔ اسی گاندھی کا انہوں نے گجرات سبھا کے صدر کی حیثیت سے اس گارڈن پارٹی میں نہایت فراخدلی اور پُرجوش انداز میں خیر مقدم کیا تھا جو بمبئی میں آباد گجراتی طبقہ نے ۱۹۱۵ء میں گاندھی کی جنوبی افریقہ سے واپسی پر اس کے اعزاز میں دی تھی۔ یہ گاندھی وہی شخص تھا جس کا نام جناح نے ہوم رول لیگ کے صدر کے لئے ۱۹۲۰ء میں اس وقت تجویز کیا تھا جب مسز اینی بیسنٹ نے استعفا دے دیا تھا۔ اس طرح ہیکٹر بولیتھو کے الفاظ میں "کانگریس میں گاندھی کے عروج کے ساتھ ہی جناح کانگریس سے دور ہو گئے"۔ بہرحال ناگ پور نے، جس نے جناح کے سیاسی پروگرام کو مسترد کرتے ہوئے گاندھی کو قیادت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کر دیا تھا، جناح کے اس "خواب" کو بھی چکنا چور کر دیا جو انہوں نے ہندوستان میں قیادت حاصل کرنے کے سلسلے میں دیکھا تھا یہی وہ مرحلہ تھا جہاں ان کی سیاسی زندگی کے پہلے دور کا اختتام ہوتا ہے۔ یوں وہ دُہرا کردار جو انہوں نے بیک وقت لیگ اور کانگریس دونوں کی کشتیوں میں قدم رکھ کر ادا کرنا شروع کیا تھا اچانک اور ہمیشہ کے لئے اختتام کو پہنچا۔ اس کے بعد آنے والے زمانے میں جناح کو صرف مسلم لیگ اور مسلمانوں کو منظم کرنے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا تھی لیکن اپنے قومی اندازِ فکر کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنے قومی کردار سے دستبردار ہوئے بغیر۔

جناح اور ہندو مسلم مفاہمت

۱۹۲۱ تا ۱۹۳۱

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء کا عرصہ جناح کے لئے بڑی حد تک گوشہ نشینی کا زمانہ تھا، اس عرصے میں وہ سیاست سے الگ تھلگ رہے۔ ساتھ ہی ہندوستان کے حالات کا بنظر غائر جائزہ لیتے اور اس کا تجزیہ بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ حالانکہ یہی وہ جماعت تھی جس میں انہیں ایک عشرے تک نہایت اہم حیثیت حاصل تھی اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے وہ قومی رہنما کا اعلیٰ ترین کردار ادا کرنے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء ۱۹۲۲ء کی خلافت تحریک سے بھی خود کو الگ تھلگ رکھا تھا، حالانکہ یہ وہ پہلی عوامی تحریک تھی جس نے ہندوستان کے طول و عرض میں ہل چل مچادی تھی اور ہندوستانی سیاست کو ایک نیا انقلابی موڑ عطا کیا تھا۔ یہ ایسی تحریک تھی جس نے جناح اور آئینی جدوجہد پر یقین رکھنے والے ان جیسے اور رہنماؤں کی عزت، وقار اور ساکھ کو نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ شدید نقصان بھی پہنچایا تھا۔ یہی وہ عوامل تھے کہ اس کے بعد سے جناح مجلس قانون ساز میں قوم کی تعمیر کا وہ کردار بھی نہ نبھا سکے جو انہوں نے اب تک اپنا رکھا تھا۔ ہندوستان اس وقت تحریک عدم تعاون

کی یلغار کی زد میں تھا، اس لئے انہوں نے ۱۹۲۰ء کے انتخابات میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔

اوائل ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو معطل کر دیا گیا تھا پھر جب ۱۹۲۳ء میں اگلے عام انتخابات ہونے والے تھے اور بعض ایسے رہنما انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے جو تحریکِ عدم تعاون کے اذیت ناک، تکلیف دہ اور پرخار راستے کی تلخیاں چکھ کر اپنے حواس میں آچکے تھے اور تحریک عدم تعاون کے تباہ کن انجام کے بعد پھر سنجیدگی کی طرف پلٹ آئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ ان کے انتخابات میں حصہ نہ لینے سے کاسہ لیس اور چاپلوس قسم کے اراکین پر مشتمل مہر چھاپ اسمبلیوں نے کس کس طرح انہیں ڈنک مارے ہیں۔ کیونکہ ان اسمبلیوں کو ہندوستانی عوام کے مفادات کے بجائے صرف سامراجی مفادات کے تحفظ سے غرض تھی۔ اس صورت حال نے ان سب رہنماؤں کو سنجیدگی سے معاملات کا از سرِ نو تجزیہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجۃً تحریک عدم تعاون میں شامل اور پیش پیش موتی لال نہرو، چتارنجن داس (۱۸۷۰ تا ۱۹۲۵) جیسے جہاں دیدہ اور پرانے کانگریسی رہنماؤں نے ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان کے اس فیصلے سے جناح کو بھی اپنی پارلیمانی زندگی کا از سرِ نو آغاز کرنے کی ترغیب ہوئی اور وہ بھی آزاد امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہو گئے جو میدانِ سیاست میں ان کی جزوی واپسی تھی۔ تاہم ایک برس بعد وہ پھر پوری توانائیوں کے ساتھ اور بھرپور انداز میں اس میدان میں آنے والے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمانوں کو بین الاقوامی اور قومی سطحوں پر دو بڑے سانحوں سے گزرنا پڑا۔

مارچ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں ترکی کی جنگِ آزادی (۱۹۱۹ تا ۱۹۲۲) کے ہیرو غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافتِ کے منصب کو یکسر ختم کر دیا۔ حالانکہ

اسی ادارے کی بحالی کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے چار برس قبل تحریک شروع کی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ترکی کی علاقائی سالمیت بحال کرنے کے ساتھ ساتھ خلیفتہ الاسلام کے منصب کو اس کے تمام دنیاوی اختیارات کے ساتھ بحال کیا جائے۔ جنگ آزادی کے نتیجے میں ترکی نے اپنے وہ تمام علاقے حاصل کر لئے تھے جہاں ترکی زبان بولنے والی آبادی موجود تھی۔ ساتھ ہی اس نے ایسے تمام علاقوں سے دستبرداری کا بھی اعلان کر دیا جو اگرچہ سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے لیکن فی الحقیقت ترک علاقے نہ تھے۔ دوسری طرف غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کو اس کے تمام دنیاوی اختیارات کے ساتھ بحال کرنے کی بجائے پہلے تو خلیفہ کے تمام اختیارات سلب کر لئے اور پھر ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے ادارے ہی کو ختم کر دیا اور اس ادارے کے آخری نمائندے کو پورے خاندان سمیت ملک بدر کر دیا۔ اس طرح جہاں ایک طرف گاندھی نے چورا چوری کے واقعہ کو بہانہ بنا کر اس سے قبل ہی تحریک خلافت کو توڑ کر اس کی حکمتِ عملی اور انداز کار کو مطعون اور موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ وہاں دوسری طرف غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے ہندوستان میں خلافت کے حامیوں کی تمام تر اپیلوں اور درخواستوں کو نظر انداز کرتے ہوئے خلافت کو ختم کر کے خلافت تحریک، خلافت کانفرنس اور اس کے رہنماؤں کو نہ صرف شرمندہ و شرمسار کیا تھا بلکہ مسلمانانِ ہند کو قیادت مہیا کرنے کے بلند بانگ دعوؤں اور دیرینہ آرزوؤں سے بھی ان کو یکسر محروم کر دیا۔ اس طرح ان سے وہ تمام فخر و افتخار بھی چھین لیا تھا جو ہندوستان میں انہیں حاصل تھا۔

دریں اثنا مسلمانوں کے خلاف شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں اچانک جس شدت اور شدومد سے ابھری تھیں مسلمانوں نے ان کے جواب میں تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں

شروع کیں۔ اس عمل اور ردِّعمل کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سنگین تصادم کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس نے کوہاٹ کے خونریز فسادات (۱۹۲۴ء) کی شکل میں اپنی انتہاؤں کو چھو لیا۔ خلافت کے پروگرام کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی جو فضا قائم ہوئی تھی ختم ہوگئی اور اس کی جگہ بداعتمادی اور شکوک و شبہات نے لے لی۔ برطانیہ کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور اقدامات کے بجائے اب ایسے بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ جنگ چھڑ گئی جس کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی تھی۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان پھر دل شکستگی اور بے حوصلگی کا شکار ہوگئے۔ خلافت کانفرنس جس نے خلافت تحریک کو جنم دیا تھا بدنام اور رسوا ہو چکی تھی اور تحریک خلافت کے وہ رہنما جو ایک سیاسی پروگرام اور ولولہ انگیز قیادت فراہم کرنے کے دعوے کرتے تھے، مایوسیوں اور ہزیمتوں کی وجہ سے منہ چھپائے پھر رہے تھے۔

مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کے مختلف طبقہ ہائے فکر کو پھر سے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور ان کے لئے ایک مربوط پالیسی وضع کی جائے جبکہ سیاسی عمل کے لئے ایک قابلِ عمل پروگرام وضع کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ یہی وہ تمام تقاضے تھے جنہوں نے جناح کو مسلم لیگ کو جو تحریک خلافت کے دوران گہنا کر پس منظر میں چلی گئی تھی از سرِ نو زندہ اور فعال کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور میں ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس کا واحد مقصد یہ تھا کہ لیگ کو ایک "زندہ اور منظم سیاسی جماعت" بنایا جائے۔ اور پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ جناح نے یہ بھی محسوس کیا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لیگ کو ایک نیا اور ولولہ انگیز مقصد دیا جائے۔ اس کے لئے نیا

زندگی آمیز اور زندگی آموز پروگرام وضع کیا جائے تاکہ اس کے لیڈر "اعتماد کے ساتھ اپنا موقف پیش کر سکیں۔" ساتھ ہی ہندوؤں کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ایسا سمجھوتہ جو مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہندو صرف کانگریس کی وجہ سے متحد اور منظم ہو سکتے ہیں تو مسلمان لیگ کے ذریعہ کیوں متحد اور منظم نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں اور لیگ کی اس تنظیم نو کا مقصد ہندوستان کی قومی پیش رفت یا اس کے قومی مفادات کو نقصان پہنچانا نہیں تھا بلکہ انہیں بقیہ ہندوستان کی امنگوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔

لاہور لیگ سیشن، جو جناح نے پنجاب کے رہنماؤں بالخصوص سر میاں فضل حسین (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۶) جیسے انتہائی بارسوخ اور بااثر رہنما کی مدد سے طلب کیا تھا مئی ۱۹۲۴ء میں ہوا اور بڑی حد تک کامیاب رہا۔ مسلم لیگ کو نہایت مؤثر انداز میں زندہ اور فعال بنا دیا گیا۔ اسے دوبارہ سیاست کے میدان میں سرگرم عمل کر دیا گیا اور اس کے اغراض و مقاصد از سرِ نو مرتب کئے گئے۔ جناح کو تین برس کے لئے اس کا مستقل صدر منتخب کیا گیا، یوں مسلمانوں کے اتحاد کے لیے طویل جد و جہد کا آغاز ہو گیا۔

اس عرصے کے دوران جناح نے مسلم لیگ کے اندر اور باہر، ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز کے اندر اور اس سے باہر، تین باہم مربوط اور ایک دوسرے سے وابستہ مقاصد کی تکمیل کے لئے ان تھک جد و جہد جاری رکھی۔ سب سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کی منتشر صفوں کی شیرازہ بندی کر کے ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کے پروگراموں اور پالیسیوں کو مقصدیت سے ہمکنار کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے لیگ کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی تجویز پیش کی تاکہ یہ کمیٹی سنیٹرل خلافت کمیٹی سے مسلمانوں کی عوامی سرگرمیوں

کو منظم کرنے کی حکمت عملی تیار کرنے کے مسئلے پر تبادلۂ خیال کرے (۱۹۲۴) علاوہ ازیں انہوں نے حکومتِ ہندوستان کا انتظامی خاکہ تیار کرنے میں تعاون اور مدد دینے کے لئے بھی سرگرمی سے کام کیا تاکہ یہ اسکیم ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی جگہ لے سکے جسے جناح غیر اطمینان بخش سمجھتے تھے۔ اصلاحات کی مجوزہ اسکیم تیار کرنے کے لئے لیگ نے جو کمیٹی قائم کی تھی (مئی ۱۹۲۴) جناح اس کے سرکردہ رکن تھے۔ علاوہ ازیں وہ اس کمیٹی کے بھی ممتاز رکن تھے جو مجلسِ قانون ساز اور دیگر منتخب اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی سے متعلق مطالبات کو حتمی شکل دینے کے لئے قائم کی گئی تھی (دسمبر ۱۹۲۴)۔ جناح ہی اس قرارداد کے بھی اصل محرک تھے (دسمبر ۱۹۲۶) جس میں ہندوستان کے لئے اصلاحات کی اسکیم وضع کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بنابریں یہ کہ اگرچہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور دشمنی کی فضا پھیلی ہوئی تھی، انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کے لئے انتھک کوششیں شروع کر دیں کیونکہ ایسے اتحاد کو وہ اصلاحات کی اسکیم وضع کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ”ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ سوراج حاصل کرنے کے لئے بنیادی اور لازمی شرط ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد ہے کیونکہ ہندوستان میں غیر ملکی راج اور اس کے تسلسل کی بنیادی وجہ یہ حقیقت ہی ہے کہ ہندوستانی عوام اور بالخصوص ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہیں اور وہ ایک دوسرے پر اعتماد بھی نہیں کرتے۔ سوراج اور ہندو مسلم اتحاد دراصل ایک دوسرے کی متبادل اصطلاحات ہیں“

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جناح نے کئی ہندو لیڈروں کو دسمبر ۱۹۲۴ء

میں ہونے والے بمبئی لیگ سیشن سے خطاب کرنے کی دعوت دی لیکن اس مسئلہ پر کہ ہندوستان کے لئے تیار کئے جانے والے مستقبل کے آئینی نظام میں مسلمانوں کو کس حد تک اختیارات ملنے چاہئیں۔ وہ ہندوؤں کی طرف سے مناسب اور تسلی بخش جواب حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے باوجود اگلے دو برس تک وہ ہندوؤں سے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کرتے رہے ان کی دلیل تھی کہ

"اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ ملک میں فرقہ وارانہ عصبیت موجود ہے۔ محض زبانی جمع خرچ اور جذباتی گفتگو سے اس عصبیت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ صرف مخلوط انتخابات کے انتظام کو اپنا کر نیشنلزم پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کینیڈا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جداگانہ انتخابات نمائندہ حکومت کی ترقی اور پیش رفت میں کوئی رکاوٹ ثابت نہیں ہوتے۔"

اس طرح ایک طرف تو انہوں نے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں کو یہ دعوت دی کہ وہ بڑھ کر مسلمانوں کا دستِ تعاون اور دستِ دوستی تھامیں ان کے ساتھ مل کر بیٹھیں اور کوئی مناسب حل تلاش کرنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیال کریں جب کہ دوسری طرف انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو تلقین کی کہ وہ ملک کے مفاد میں ایک لچک دار رویہ اختیار کریں۔

۱۹۲۴ء سے جناح کی کوشش یہی رہی تھی کہ ایک طرف مسلمان اپنے مطالبوں کو اتفاق رائے سے حتمی شکل دے دیں اور دوسری طرف ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان مصالحت کی ایک تازہ فضا قائم ہو جائے۔ حالانکہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ ۱۹۲۲ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ان فرقوں کے

درمیان کشیدگی اور آویزش میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ جناح کی ان کوششوں کا مقصد سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کوششوں کو ۱۹۱۹ء کے ایکٹ پر نظرِ ثانی کے لئے ہندوستانیوں کے مطالبے کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ اساسی طور پر اس ایکٹ میں کہا گیا تھا کہ دس برس بعد اس کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ لیکن مجلس قانون ساز نے جو بڑی تعداد میں منتخب نمائندوں پر مشتمل تھی مطالبہ کیا کہ "اس دستور کا ۱۹۲۹ء سے قبل ہی از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور اس پر نظرِ ثانی کی جائے۔" پھر ۱۹۲۴ء میں نئی اسمبلی نے جو "حالیہ انتخابات میں سوراجیوں کے منتخب ہونے کی وجہ سے زیادہ سخت گیر عناصر پر مشتمل تھی" مطالبہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ پر نظرِ ثانی کی جائے۔ خود جناح نے بپن چندر پال کی اس قرارداد کی حمایت کی تھی جس میں "ہندوستان کو مکمل حکومتِ خود اختیاری کے ساتھ ڈومینین کا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایکٹ پر نظرِ ثانی کے لئے کہا گیا تھا۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے تہیہ کر رکھا تھا کہ معاملات کے مکمل جائزے کے بعد ہی وہ اس ایکٹ پر نظرِ ثانی کرے گی، تاہم "مڈی مین کمیٹی" کے تقرر (۱۹۲۴) پر حکومت کی رضامندی سے یہ بھی ظاہر تھا کہ اگر ہندوستانیوں کی طرف سے اس مسئلے پر اصرار جاری رہا تو ہوسکتا ہے کہ وہ یہ مطالبہ منظور کرلے۔ تاہم برطانوی حکومت نے یہ کمیٹی قانون سازی کے احکام کا جائزہ لینے کے لئے قائم کی تھی، ایکٹ میں ترمیم کرنے کے لئے نہیں۔ سابقہ عشروں کی طرح جناح اس مرتبہ بھی اس بات کے متمنی تھے کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی کارگزاری کے بارے میں تحقیقات سے قبل ہی ایک ہندو مسلم سمجھوتہ ہوجائے تاکہ برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کی طرف سے ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا جاسکے۔ اس سے قبل پچھلے عشرے میں میثاقِ لکھنؤ کی صورت میں جناح ایک مصالحتی فارمولا وضع کرچکے تھے۔ یہ فارمولا ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مونٹیگو اعلان

اور بعد میں اصلاحات کی اگلی قسط کے مندرجات اور نوعیت پر ہندوستانی عوام سے مشورہ کرنے کے لئے مونٹیگو کے دورۂ ہندوستان سے بہت عرصے قبل تیار کر لیا گیا تھا لیکن اب میثاقِ لکھنؤ کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کانگریسی (اور ہندو) رہنماؤں نے ایک مرتبہ پھر فرقہ وارانہ بنیاد پر انتخابات کی مخالفت کا پرانا موقف اختیار کر لیا تھا اور وہ انہیں ختم کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں میں یہ احساس شدت سے جڑ پکڑ گیا تھا کہ اس میثاق کے ذریعے ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر کے ان کے ساتھ فریب کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان مختلف بنیادوں پر اب میثاقِ لکھنؤ سے ہندو اور مسلم دونوں شاکی تھے۔ لہٰذا اس پس منظر میں میثاق لکھنؤ کا ایک ایسا متبادل تلاش کرنے کی ضرورت تھی جس میں مسلمانوں کے بنیادی مطالبات بھی شامل ہوں، کیونکہ اسی طرح ہندوستان کے ان دو بڑے فرقوں کے درمیان کسی ایسے سمجھوتے کی کوئی بنیاد پڑ سکتی تھی جس کے جناح متمنی تھے۔

چنانچہ جناح نے اس موضوع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطہ ہائے نظر پر مشتمل ایک مصالحتی فارمولا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہندو لیڈر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار عوامی جلسوں میں کر ہی رہے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف غیر رسمی ملاقاتوں اور ان طویل مذاکرات میں بھی وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کر رہے تھے جن میں جناح ان کے ساتھ ۱۹۲۴ء سے مصروف تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور اس کی بنیاد علاوہ ازیں مسلمانوں کے مطالبات کے بارے میں نمائندہ مسلمان رہنماؤں نے اپنے خیالات کا اظہار اس غیر رسمی کانفرنس میں کیا جو جناح نے طلب کی تھی اور ان کی صدارت میں دہلی کے مقام پر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں تمام مسائل پر غور و فکر ہوا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے نئی تجاویز مرتب کی گئیں۔

ان میں جن رہنماؤں نے شرکت کی وہ مختلف مسلم نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان میں تحریک خلافت کے مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور نواب محمد اسماعیل جیسے پائے کے رہنما بھی شامل تھے۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد، سید عبدالرحیم اور عبدالمتین چودھری جیسے میانہ رو رہنما بھی شامل تھے اور سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم اور سر ذوالفقار علی خان جیسے برطانیہ کے حامی عناصر بھی شریک تھے۔ یوں دیکھا جائے تو مارچ ۱۹۲۷ء کی دہلی مسلم تجاویز تمام مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کا مظہر تھیں اور میثاق لکھنو کا متبادل بھی۔

ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان اختلافات کم سے کم کرنے کے لئے دہلی تجاویز اس انداز سے مرتب کی گئی تھیں کہ ہندوؤں کے مختلف حلقے مختلف سطحوں پر ان سے مطمئن ہو سکیں۔ اسی لئے دہلی میں جمع ہونے والے مسلمان رہنماؤں نے ان تجاویز میں ایسے متنازعہ مسائل کو نہیں چھیڑا تھا جن کا تعلق ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب، کسی فرقے کو متاثر کرنے والے بل کی منظوری کے لئے پیشگی شرائط وغیرہ سے تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنی تمام تر توجہ انتخابی حلقہ بندیوں اور مختلف مجالس قانون ساز میں نشستوں کی تقسیم اور تعین پر ہی مرکوز رکھی۔ ان تجاویز کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاست میں برابری پر مبنی اقتدار میں شرکت کا ایک ایسا نظام وضع کرنا تھا جس سے ایک طرف تو اکثریتی اور اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور دوسری طرف ہندوؤں کے ان حقوق کی نفی بھی نہ ہو جو مرکز اور اکثریتی علاقوں میں شریک غالب کی حیثیت سے ان کا مطالبہ تھا۔

ان تجاویز میں جہاں مرکز میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نمائندگی بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ،

پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا، وہیں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ان مطالبات کو تسلیم کر لیا تو مسلمان جداگانہ انتخابات کے حق سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جداگانہ انتخابات کو جناح مقصد حاصل کرنے کا ایک وسیلہ سمجھتے تھے یعنی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا ذریعہ اور اگر یہ مقصد ہندو اکثریت کے سات صوبوں کے مقابلے میں مسلم اکثریت کے پانچ صوبوں کو مستحکم اور متوازن کر کے اور مرکز میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں مخصوص کرا کے حاصل ہو جاتا تو وہ جداگانہ انتخابات کو قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی قابلِ عمل طریقۂ کار وضع کر لیا جائے۔ دوسری طرف ہندوؤں کا رویہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کے حق سے تو محروم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے عوض مسلمانوں کا کوئی بھی مطالبہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے، حالانکہ مسلمانوں نے شرط یہی رکھی تھی کہ اگر ان کے بقیہ مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو وہ مخلوط انتخابات قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اگرچہ جناح نے مسلمانوں کی ان تجاویز پر ہندوؤں کے مخاصمانہ رویئے کو بھانپ لیا تھا لیکن ساتھ ہی وہ پورے خلوص سے چاہتے تھے کہ ہندو مسلم سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے۔ اس لئے اب (۱۹۲۸) میں انہوں نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اگر مسلمانوں کے صرف تین بنیادی مطالبات منظور کر لئے جائیں، جو مرکز، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات اور سندھ کی بمبئی سے علٰحدگی سے متعلق تھے، تو سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے ان کم سے کم مطالبات کو تسلیم

کرنے پر رضامند کرنے کے لئے انہوں نے کلکتہ مشتمل کنونشن (۱۹۲۸ء) میں بھرپور کوشش کی۔ یہ کنونشن نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اگرچہ جناح کے دلائل نہ قابل تردید تھے لیکن ہندو لیڈروں نے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میکنڈرا مارا او جیکار (۱۸۷۳ء تا ۱۹۵۸ء) نے کنونشن میں ہندو نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے نہ صرف جناح کی تجاویز کی پُرزور مخالفت کی بلکہ یہ سوال بھی کیا کہ آخر انہیں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا کیا حق ہے۔ سر تیج بہادر سپرو (۱۸۷۵ء تا ۱۹۴۹ء) نے جناح کو "ایک بگڑا ہوا بچہ" قرار دیتے ہوئے ہندوؤں کو مشورہ دیا۔

"جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں وہ دے کر قصہ ختم کر دو۔ اگر آپ لوگ اس پنڈال سے ناکام ہو کر باہر نکلے تو یاد رکھئے کہ آپ ملک کو بہت بڑا نقصان پہنچائیں گے اور ملک ربع صدی تک اس نقصان سے بحال نہ ہو سکے گا۔"

ترامیم پر بحث کا جواب دیتے ہوئے جناح نے ایک مرتبہ پھر ہندو لیڈروں کو دلائل سے قائل کرنا چاہا لیکن بے سود۔ انہوں نے کہا۔

"ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب تک ہمارا مقصد حاصل نہ ہو جائے ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ آگے بڑھیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ مسلمانانِ ہند کو ساتھ لے کر چلیں اور یاد رہے کہ یہاں میں ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں سات کروڑ مسلمانوں کو جدوجہد آزادی میں اپنے ساتھ شانہ بشانہ چلتے دیکھوں کیا آپ میں سے چند حضرات، ان میں سے چند ایک کو اپنا ہم سفر بنا

بنا کر مطمئن ہو سکتے ہیں ؟ کیا آپ میرے اس اعلان سے مطمئن ہو سکتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں ؟ سوچئے کہ آپ ہندوستانی مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں دو بڑے فرقے ہیں۔ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان۔ اور یہ بات میں ہندوستان کے دوسرے فرقوں کی اہمیت کم کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں جن میں سکھ عیسائی اور پارسی شامل ہیں۔ لہٰذا قدرتی امر یہ ہے کہ ہندوستان کے یہ دو بڑے فرقے یعنی ہندو اور مسلمان مصالحت کر لیں، متحد ہو جائیں، یہ محسوس کریں کہ ان کے مفادات مشترک ہیں اور وہ ایک مشترک مقصد کے حصول کے لئے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات مدبرانہ صلاحیتوں کے تقاضے پورے کریں جیسا کہ سر تیج بہادر سپرو نے کیا ہے۔ اقلیتیں کبھی اکثریت کو کچھ نہیں دے سکتیں۔ لہٰذا اس بات سے کوئی فائدہ نہیں کہ آپ مجھ پر یہ زور دیں کہ میں اُن امور پر اصرار نہ کروں جنہیں آپ حضرات "چھوٹے چھوٹے نکات" قرار دیتے ہیں۔ میں آپ سے یہ ترامیم اس لئے نہیں مانگ رہا ہوں کہ میں ایک "شریر بچہ" ہوں۔ اگر یہ نکات چھوٹے چھوٹے ہی ہیں تو پھر انہیں منظور کرنے میں کیا قباحت ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اکثریت کا کام ہے اور اکثریت ہی کچھ دے سکتی ہے۔"

لیکن ہندو اکثریت مصالحت پر تیار نہیں تھی حالانکہ اس سودے بازی میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات سے دستبردار ہونے کی پیشکش بھی کی تھی جو

خود ہندوؤں کی ایک بڑی خواہش تھی۔ یوں جناح کی ترامیم کو ایک ایک کر کے مسترد کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے رائے شماری میں اس بنا پر حصہ نہیں لیا تاکہ انہیں یہ اندازہ ہو سکے کہ ان کے مطالبات پر غیر مسلموں کا کیا رویہ ہے۔

بقول رام گوپال اس رائے شماری سے مسلمانوں پر یہ واضح ہو گیا کہ

"یہ کنونشن اگرچہ عملی طور پر ہندوؤں کا نہیں تھا لیکن بنیادی طور پر غیر مسلموں کا ضرور تھا۔ مسلمانوں نے اس کنونشن میں کمیٹی کی اس ہٹ دھرمی کو بھی دیکھ لیا، جو اس نے بہت معمولی لیکن قابلِ قبول نکات پر اختیار کی۔ یہ ایک ایسی آمرانہ روش تھی جو اس کنونشن نے ہندو اکثریت کے بل بوتے پر مسلط کر دی تھی۔"

بہر حال جناح کے مطالبات کا اس طرح مسترد کر دیا جانا ایک نہایت ہی افسوس ناک بات تھی، کیونکہ ان دنوں جناح لیگ میں انقلابی بازو کی نمائندگی کرتے تھے۔ بقول چمن لال سیتل واڈ، جناح

"نیشنلسٹ نقطۂ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان مسلم مفادات کی بھی کسی نہ کسی طریقے سے حفاظت کرنا چاہتے تھے جنہیں واقعی تحفظ کی ضرورت تھی۔ بہر حال اس کے بعد جو حالات اور واقعات پیش آئے انہیں دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص اس بات پر افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مرحلے پر فرقہ وارانہ مسئلے کو پُر امن طور پر حل کرنے کا جو ایک موقع ہاتھ آیا تھا اسے ضائع کر دیا گیا۔"

اس کنونشن میں تقریباً بارہ سو مندوبین نے شرکت کی جو ۳۰ تنظیموں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ گوپال رقمطراز ہے کہ کنونشن منعقد کرنے والوں نے بھی اس

حقیقت کو نہ سمجھا کہ ان میں سے بہت سی تنظیموں کے بغیر اگر مسلم لیگ سمیت ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کر لی جاتی تو یہ کنونشن زیادہ نمائندہ ہوتا اس سے بھی زیادہ خرابی کی بات یہ تھی کہ کانگریس کے دفدیے بھی جن کو اس کنونشن میں نمایاں اور اصل اہمیت حاصل تھی، ہندو مہاسبھا اور سکھ لیگ کی پیروی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اگر کانگریس کے لیڈر اتنے ہی حقیقت پسند ہوتے جتنے جناح تھے تو ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ لیکن وہ کیونکہ محض سیاستدان تھے اس لئے وہ وقت کے تقاضوں کو نہ تو سمجھ سکے نہ ان پر پورا اتر سکے۔ اس طرح انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھ آنے والا ایک نہایت نادر موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اس کنونشن میں جتنی ڈھٹائی کے ساتھ مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کو ماننے سے انکار کیا گیا وہ جناح کی زندگی بھر کی ان کوششوں پر ایک تباہ کن اور کاری ضرب تھی جو وہ ایک طرف کانگریس اور لیگ اور ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے لئے کرتے چلے آئے تھے۔

اس کنونشن میں مسلمانوں کی آخری امید بھی مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔ جبکہ جناح کے لئے یہ "راستے جدا ہوتے" کا مرحلہ تھا۔ جو چیز ان کے لئے شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض شرائط کے ساتھ جداگانہ انتخابات سے دستبردار ہونے کی پیش کش کر کے اپنے ہم مذہبوں میں اپنی پوزیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور دوسری طرف ہندو رہنما گاندھی، موتی لال نہرو اور جیکار تھے جو اس بات کو بھی سمجھنے میں ناکام رہے کہ جناح نے انہیں کتنی بڑی رعایت کی پیش کش کی تھی۔ اس کے بعد پھر کبھی جناح نے اس غلطی کا اعادہ نہ کیا۔ انہوں نے کبھی وقت سے پہلے حریف کو اپنے پتے نہ دکھائے۔ پھر کبھی انہوں نے اپنے پرانے کانگریسی ساتھیوں اور ان کی باتوں پر اعتماد نہ کیا۔ کم از کم اتنی بڑی حد تک۔

جناح اور مسلم اتحاد

۱۹۲۴ تا ۱۹۳۱

گوشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ جناح نے خود کو پوری طرح نیشنلسٹ کاز کے لئے وقف کر رکھا تھا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کے مفادات بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اس وقت تک کسی بھی مرحلے پر یہ تسلیم نہیں کیا کہ نیشنلسٹ کاز اور مسلم کاز کے درمیان کوئی تفاوت یا تصادم ہے۔ یا آئندہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود تیسری دھائی کے خاتمے اور چوتھی دھائی کے آغاز کے ساتھ ہی یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہا تھا کہ لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵ تا ۱۹۲۸)، مدن موہن مالویہ (۱۸۶۱ تا ۱۹۴۶)، اور جیکار جیسے لیڈر، جو نیشنلسٹ کاز کے نمایاں اور سرکردہ ہندو مبلّغ اور علمبردار تھے نیشنلسٹ سیاست کی کیا کیا تاویلات اور تشریحات کرتے رہتے۔ ان کے برخلاف جناح دو مختلف مقاصد۔ یعنی ہندو فرقہ وارانہ مقاصد اور مسلم مقاصد کو کبھی خلط ملط کرنے پر تیار نہ تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۱ء میں بھی جناح نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ "میں پہلے ہندوستانی اور پھر مسلمان ہوں" بالاصرار کہا تھا۔ "ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ کوئی بھی ہندوستانی، مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کر کے اپنے ملک کی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی

نشاندہی کی تھی کہ نمائندہ حکومت کا مطلب یہ نہیں کہ ایک آئین کے ذریعے سات کروڑ مسلمانوں کو ان کے ہاتھ پیر باندھ کر ہندوؤں کے ایک مخصوص فرقے کے سامنے ڈال دیا جائے تاکہ وہ ان پر جو ظلم و ستم چاہے کریں ۔ اور جو جی میں آئے ان کے ساتھ سلوک روا رکھیں۔ جناح کا کہنا تھا کہ اس قسم کی کوئی بھی حکومت نہ نمائندہ ہو سکتی ہے اور نہ جمہوری۔

۱۹۱۶ء میں جناح نے بڑی کدو کاوش کے نتیجہ میں کانگریس سے یہ تسلیم کرالیا تھا کہ آئینی نہج پر بھی مسلمان ہندوستانی جسدِ سیاست میں ایک منفرد اور جداگانہ عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی یہ حیثیت اصلاحات کی اگلی قسط میں برقرار رکھنے کو یقینی بنا دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء ایکٹ میں ایک مرتبہ جب کل ہندوستان نظام میں مسلمانوں کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اس امر پر مرکوز کر دی کہ مسلمانوں کو ان کے اکثریتی علاقوں میں قانونی اکثریت بھی حاصل ہو جائے اور اس حیثیت سے انہیں اختیارات بھی مل جائیں۔ اس موقع پر مسلمانوں میں تحفظ کا احساس اجاگر کرنے کے لئے یہ مرحلہ طے کرنا نہایت ضروری تھا کیونکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت مسلم اکثریتوں کو جو پنجاب میں ۵۵ فیصد اور بنگال میں ۵۴ء۷ فیصد تھی۔ مجالس قانون ساز میں اس اکثریت کو کم کر کے علی الترتیب ۴۸ فی صد اور ۴۰ فیصد کر دیا گیا تھا۔ اب جب کہ اصلاحات کی اگلی قسط میں صوبائی خود مختاری کے امکانات پیدا ہو گئے تھے جناح کی کوششیں انہی امور پر مرکوز تھیں کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو قانونی اکثریت حاصل ہو جائے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کیا جائے اور بقیہ اختیارات صوبوں کو سونپے جائیں۔ ہندوستان میں چونکہ سات ہندو اکثریتی صوبوں کے مقابلے میں توازن

پیدا کرنے کے لئے پانچ مسلم صوبے موجود تھے لیکن حقیقی توازن قائم کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو قانونی اکثریت بھی حاصل ہو علاوہ ازیں مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں حاصل ہونا تھیں اور کیونکہ ہر دو فریقوں کو متاثر کرنے والے تمام مسائل سے متعلق امور کو نمٹانے کے لئے ہر دو فرقے کی دو تہائی اکثریت (دوسرے ووٹ) کی شق بھی موجود تھی۔ اس طرح ایک حقیقی وفاقی آئین بے رحم ہندو اکثریت سے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا ضامن ہو سکتا تھا۔ اسی طرح مسلمان "ہندوستان کی وحدت"، کو زک پہنچائے بغیر اس کے امور میں شرکت اور اس سے وابستگی کے احساس سے سرشار ہو کر کام کر سکتے تھے۔

جناح کے اس اندازِ فکر کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۴ء کے بعد اُن کی تقریروں میں ہوا۔ یہی اندازِ فکر دہلی مسلم تجاویز کی بنیاد بنا اور پھر جناح کے مشہور چودہ نکات (مارچ ۱۹۲۹) میں واضح طور پر نکھر کر سامنے آیا۔ چودہ نکات جناح کی طرف سے نیشنل کنونشن میں ہندو رویے کا جواب تھے۔ یہ نکات ان کی طرف سے آل پارٹیز مسلم کانفرنس (جنوری ۱۹۲۹) کی قرار دادوں کا بھی متبادل تھے۔ یہ نکات دراصل اس کنونشن اور مذکورہ کانفرنس کی کارروائیوں کے پس منظر میں جناح کی جوابی کارروائی بھی تھے۔ واضح رہے کہ نیشنل کنونشن میں تو جناح نے شرکت کی تھی لیکن آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں وہ شریک نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال ان دونوں اجتماعات نے انہیں سیاسی طور پر بالکل یکہ و تنہا کر دیا تھا۔ اور ان کی قیادت کی نفی کر دی تھی۔

حالات کے اس پس منظر میں دیکھا جائے تو چودہ نکات پیش کر کے جناح نے مسلمانوں کی صفوں میں موجود اختلافات ختم کرنے کے لئے ایک جرأت مندانہ قدم

اٹھایا تھا۔ یہ نکات جہاں (ممکنہ حد تک) مسلمانوں کے مختلف نقطہ ہائے فکر میں ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے تھے وہیں نہرو رپورٹ کے بارے میں جناح کے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بھی پیش کرتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ دہلی مسلم تجاویز انتخابی مسئلہ پر "نیشنلسٹ" رجحان کے تقاضوں کے پیش نظر وضع کی گئی تھیں لیکن چودہ نکات اس سے قطعی متضاد طور پر خالصتاً مسلم نقطۂ نظر کے غماز تھے۔ جناح کے رویے میں یہ تبدیلی نہایت اہم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ضروری بھی تھی۔ اسی طرح ایک مسلمہ مسلم رہنما کی حیثیت سے ان کی ساکھ اور وقار کی بحالی کا امکان تھا کیونکہ ان کی ساکھ اور وقار کو

دہلی مسلم تجاویز میں اور نہرو رپورٹ میں ترامیم پیش کرتے ہوئے مصالحتی انداز اختیار کرنے، نیشنل کنونشن میں ہزیمت اٹھانے، اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں بالواسطہ اپنی قیادت کی نفی کی وجہ سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس وقت ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان پے در پے شکستوں کے جو نتائج اور اثرات مرتب ہوئے ہیں کبھی زائل نہ ہو سکیں گے۔ جناح کے چودہ نکات چونکہ اس وقت مسلمانوں کی امنگوں اور خواہشات کے آئینہ دار تھے۔ اس لئے یہ نکات گول میز کانفرنس (۱۹۳۰-۱۹۳۲) میں مسلمانوں کے مطالبات کی بنیاد بن گئے۔ یہ گول میز کانفرنس لندن میں بلائی گئی تھی اور اس کا مقصد ہندوستان کے لئے مستقبل کے آئین پر تبادلۂ خیال اور اس کی تیاری تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جناح کے ان چودہ نکات میں سے بعض نکات کو کمیونل ایوارڈ (۱۹۳۲) میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس طرح بعض نکات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بھی شامل کئے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگلے گیارہ برس کے دوران یعنی قیامِ پاکستان تک یہ نکات اسلامیانِ ہند کا دستور العمل بنے رہے۔

اس مرحلے پر صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے دیگر مسلم رہنماؤں کی طرح جناح بھی ۱۹۲۹ء کے بعد سے بڑی حد تک اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ کانگریس صرف نام کی حد تک قومی جماعت ہے ورنہ نیشنلزم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مزید یہ کہ کانگریس درحقیقت ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے اور یہ بالادستی وہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو قربان کر کے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کانگریس کے اس رویے اور فکر کی مزید تصدیق ۱۹۳۰ء۔ ۱۹۳۱ء میں اس وقت ہو گئی جب کانگریس نے یہ دعویٰ بھی شروع کر دیا کہ صرف وہی ہندوستانی امنگوں اور خواہشات، ہندوستانی نیشنلزم اور تمام اقلیتوں کی واحد مسلّمہ اور مصدقہ ترجمان ہے۔ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱) میں جب گاندھی نے نہایت رعونت کے ساتھ دوسری پارٹیوں اور شرکاء کو غیر اہم اور فضول قرار دیا تو یہ بات بھی نکھر کر سامنے آ گئی کہ اقلیتوں کے سوال پر کانگریس سے کسی قسم کی مصالحت ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے گول میز کانفرنس میں جو رویہ اختیار کیا اور بعد ازاں کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء کی جس شدت سے اس نے مخالفت کی اس سے تعاون باہم کے بارے میں کانگریس کا بھرم بھی کھل گیا اور یہ حقیقت بھی پوری طرح عیاں ہو گئی کہ کانگریس، نیشنلسٹ سیاست (جس کا کانگریسی رہنما بہت پُر زور انداز میں پرچار کرتے تھے) اور مسلم کاز کے درمیان کیا فرق اور امتیاز روا رکھتی ہے۔ چنانچہ جناح جیسے ہوشیار اور زیرک سیاست دان کے لئے ان تمام حقائق کو سمجھنا اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔

قطعیت کے ساتھ یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ آخر جناح کانگریس کی اس دوعملی اور منافقت کے بارے میں حتمی نتیجے پر کب پہنچے۔ تاہم ان کے بیانات اور رویوں کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کانگریس کی طرف سے ان کی مایوسی اور بددلی

کا آغاز نہرو رپورٹ سے ہوا اور ۱۹۳۷ء میں یہ مایوسی ان حدود کو پہنچ گئی جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ یہ وہ سال تھا جب کانگریس نے لیگ کے دوش بدوش انتخابات میں حصّہ لیا تھا۔ لیکن جب اس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرلی تو اس نے نہایت رعونت اور غرور سے کام لیتے ہوئے مخلوط حکومت کے قیام سے انکار کردیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو ایک جداگانہ فرقے کی حیثیت سے (یعنی اجتماعی یا کل ہند سطح پر) اقتدار میں شریک کرنے سے بھی انکار کردیا تھا۔ یہ بات کہ جناح اب اس مقام کی طرف بتدریج بڑھ رہے تھے جہاں سے واپسی کا سوال ہی ممکن نہ تھا اُس وقت سامنے آ گئی جب اپریل ۱۹۳۷ء میں دہلی کے مقام پر جمعیت العلماء کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر جناح نے جو افتتاحی تقریر کی وہ اس امر کی غمّاز ہے کہ نہرو رپورٹ کے بعد سے ان کے اندازِ فکر اور رویے میں کیا تبدیلی آرہی تھی۔ جمعیت کانفرنس کے موقع پر جناح نے ایک مرتبہ پھر اس موقف کا اعادہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمان دوسرے فرقوں کے تعاون سے جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لئے تیار اور سینہ سپر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اقلیتوں کے ان خدشات کا بھی اظہار کردیا کہ صوبائی خودمختاری کے بعد اکثریتیں ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ انہوں نے خبردار کیا۔

> "خدشہ ہے کہ اکثریتیں ظلم و تشدد کی راہ اختیار کریں۔ اقتدار و اختیار کا نشہ لوگوں کو مدہوش کرسکتا ہے۔ لہٰذا جمہوری حکومت کے متعلق کسی بھی اسکیم میں اقلیتوں کے لئے تحفظات کی فراہمی ضروری ہے۔"

کارزارِ سیاست کے ایک ذہین اور ہوشیار مجاہد کی حیثیت سے جناح اسمبلی چیمبر کے اندر اور باہر معرکے سر کرسکتے تھے اور اپنے سیاسی حریفوں کو نیچا بھی دکھا سکتے تھے۔ تاہم مسلمانوں کو ان کی منزل تک پہنچانے اور ساتھ ہی ہندو مسلم مصالحت

کی کوئی صورت نکالنے کے جو دو مقاصد، انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے دوسرے دور (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۶ء) میں اپنے پیش نظر رکھے تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل ذہانت اور سیاسی نشیب و فراز سے واقفیت سے کہیں برتر اور اعلیٰ صلاحیتوں کی متقاضی تھی۔ اس دور میں جناح نے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے صبح و مسا اور روز و شب انتہائی عرق ریزی اور جاں کاہی کے ساتھ انتھک محنت کی لیکن ہر مرتبہ، ہر قدم پر انہیں جزدی یا کلی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں اس دور کے اختتام تک انہیں یقین آچکا تھا کہ کانگریس کے رویے اور روش کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم ہونا محال ہے۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے پھر پنڈت مدن موہن مالویہ سے بات چیت کی۔ ۱۹۳۵ء کے اوائل میں انہوں نے کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد سے طویل مذاکرات کئے اور قابلِ عمل فارمولا بھی تیار کر لیا، لیکن ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی مخالفت کی وجہ سے جس کا اصل مرکز بنگال اور پنجاب تھے، یہ فارمولا بھی اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

متحدہ ہندوستان کے سیاق و سباق میں ہندو لیڈروں سے مذاکرات کے ذریعے ہندو مسلم مصالحت کے لیے جناح نے جتنی بھی اہم کوششیں کیں ان میں یہ آخری کوشش تھی۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے اس مرحلہ پر جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور گاندھی سے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک طویل خط و کتابت بھی کی تھی۔ مزید ۱۹۴۶ء تک مختلف کانگریسی زعماء سے گفت و شنید بھی کرتے رہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے معاملات میں انہیں ٹھوس اور عملی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے لیگ کو زندہ کیا۔ حالانکہ اس وقت کئی اور مسلم جماعتیں بھی قائم تھیں یا ابھر رہی تھیں۔ مسلم لیگ کو مسلم سیاست کا مرکز بنائے رکھا۔ لیگ کو از سر نو متحد کیا، اور ۱۹۳۴ء میں جب انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو نہ صرف

دیگر مسلم جماعتوں (مثلاً جمعیت علمائے ہند) نے اس کا خیر مقدم کیا بلکہ میاں فضل حسین جیسے لیڈروں نے بھی خیر مقدم کیا۔ حالانکہ وہ جناح سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کامیابیاں اب بھی ان کی منتظر تھیں۔ بہر حال اس کے بعد سے انہوں نے تمام تر توانائیاں مسلم وحدت و اتحاد، مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی پلیٹ فارم بنانے، اور اسلامیانِ ہند کے لئے کل ہند بنیادوں پر ایک ایسی مشترکہ پالیسی وضع کرنے پر مرکوز کر دیں، جن پر اسلامیانِ ہند پورے خلوص اور وفاداری سے عمل پیرا ہو سکیں۔

۱۹۳۷ء کے اوائل تک دوسرے مسلم لیڈروں کی طرح جناح کو بھی اس بات پر یقین تھا کہ ایک صحیح اور وفاقی آئین کے ذریعے مسلمانوں کے مفادات کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے اور محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر مبنی وفاق کے لئے جد و جہد کی لیکن چوتھی دہائی کے آواخر میں کانگریس نے برسر اقتدار آ کر ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کیساتھ جو سلوک کیا اور جو رویہ اختیار کیا تو جناح کو بھی یقین آ گیا کہ کانگریس ایک وفاقی آئین کو بھی مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو کچلنے اور دبانے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء کے وسط سے انہوں نے پوری شدت سے کانگریس کی مخالفت شروع کر دی۔ دوسری طرف اب انہوں نے اپنی تمام تر توجہ صرف اور صرف مسلمانوں کے امور کی نگرانی پر مرکوز کر دی۔ اب وہ صرف مسلم اتحاد کے لئے سرگرم عمل تھے، ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے کوشاں تھے، ایک ایسی پالیسی بنانے میں ہمہ تن مصروف تھے جس پر ہندوستان کے مسلمان پورے خلوص اور یقین کے ساتھ گامزن ہو سکیں۔ یہی وہ کردار تھا جس کی بنا پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اسلامیانِ ہند کے غیر متنازعہ رہنما کی حیثیت سے

ابھرنا تھا۔ اس قوم کا قائداعظم بننا تھا۔ تاہم مسلمانانِ ہند کے عظیم تر قائد کی حیثیت سے جناح کا سامنے آنا کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کیونکہ مسلمانوں کے کئی جہاں دیدہ اور تجربہ کار رہنماؤں نے بہت عرصے قبل ہی تمام امیدیں اور توقعات ان سے وابستہ کرلی تھیں اور انہیں یقین تھا کہ جناح ہی وہ لیڈر ہیں جو قومی جدوجہد میں مسلمانوں کی کامیابی کے ساتھ قیادت کر سکتے ہیں۔

تیسری دہائی کے اوائل میں صرف دو لیڈر ایسے تھے جو اس عظیم کردار کے اہل ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک رہنما کا تعلق انقلابی بازو سے اور دوسرے کا تعلق حکومتِ ہند کے وفاداروں سے تھا۔ ۱۹۲۰ء کی جذبات انگیز اور ہیجان خیز فضا میں پورا مسلم ہندوستان جب تحریک خلافت اور ترکی کے مستقبل کی طرف سے اپنی قدرتی بے چینی اور تشویش کی بنا پر ایک بحرانی کیفیت کا شکار تھا۔ پان اسلام ازم کے داعی، مولانا محمد علی اسلامیان ہند کے ایسے ہی رہنما بن کر ابھرے۔ وہ یہ کردار ۱۹۲۴ء تک ادا کرتے رہے۔ مگر ۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کی ناکامی اور ۱۹۲۴ء میں اس کے چپ چاپ خاتمے کے واقعات ایسے تھے جن کی بنا پر ان کی حیثیت متاثر ہوئی اور اس کردار کیلئے لوگ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ تاہم انہوں نے لیگ پر قبضے کے لئے چند کوششیں بھی کیں جو ناکام رہیں۔ اس کے بعد جب سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء) کے بائیکاٹ کے مسئلہ پر حکومت ہند کے وفادار میاں محمد شفیع سے جناح کے اختلافات ہوئے تو مولانا محمد علی نے جناح کی حمایت کی اور ساتھ ہی لیگ کی قیادت پر ہونے والی رسہ کشی میں بھی جناح کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ اس رسہ کشی میں شکست کے بعد میاں محمد شفیع نے لیگ کے مقابلے میں شفیع لیگ بنائی (۱۹۲۷ء)، لیکن آخر کار وہ پھر مسلم لیگ میں واپس آ گئے۔ (۱۹۳۰ء) اس وقت لیگ کے سربراہ جناح تھے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی

کی وفات اور ایک برس بعد میاں محمد شفیع کے انتقال کی وجہ سے جناح کے لئے اعلیٰ ترین سطح پر مسلمانوں کی قیادت کا میدان خالی تھا۔ اس سے قطع نظر بھی مسلم سیاست میں جناح کو ۱۹۱۶ء سے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ البتہ تحریک خلافت کے دوران وہ پس منظر میں چلے گئے تھے۔ اپنی سیاسی زندگی کے تمام نشیب و فراز اور مختلف سیاسی ناکامیوں کے باوجود جناح ہمیشہ پیش منظر میں ہی رہے اور ہمیشہ ان کے بارے میں یہی امکان رہا کہ وہ یقیناً ایک پُرعزم قائد کی حیثیت سے ابھریں گے۔

جناح سے اپنے ابتدائی اختلافات کے باوجود مولانا محمد علی کو بھی جناح سے بہ توقعات وابستہ تھیں کہ صرف وہی ایسے واحد مسلم رہنما ہیں جو ہندو مسلم کشمکش اور چپقلش کے دوران مسلمانوں کی کامیابی سے رہنمائی کر سکتے ہیں اور انہیں ان کی متعینہ منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ۱۹۳۰ء کے آواخر میں لندن روانگی کے وقت مولانا محمد علی علیل تھے۔ انہیں جہاز پر سوار کرانے کے لئے جب اسٹریچر پر لے جایا جا رہا تھا تو مولانا محمد علی نے جناح کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں اعتراف کیا تھا۔ اس کے چار سال بعد مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجتماع نے مسلمانوں کے انتشار پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، مسلمانوں کی از سرِ نو شیرازہ بندی کے ساتھ ساتھ لیگ کو پھر سے فعال بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس مقصد کے لئے اس اجتماع کی نظریں جناح کی طرف اٹھیں۔ چنانچہ اس اجتماع کی طرف سے جناح کو لندن کے پتے پر ایک تار روانہ کیا۔ یاد رہے کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے رویے سے انتہائی مایوس اور بد دل ہو کر جناح نے ہندوستان کو خیر باد کہہ دیا تھا اور انگلستان میں آباد ہو گئے تھے۔ اس تار میں جناح سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان واپس آکر لیگ کا انتظام اور قیادت سنبھالیں۔

اسے منظم کر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے اس کی سابقہ حیثیت بحال کریں۔ جناح پر ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو کس قدر اعتماد اور بھروسہ تھا اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اپریل ۱۹۳۴ء میں جب انہیں متفقہ طور پر مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا تو مجلسِ قانون ساز کے کئی مسلم اراکین نے اپنی نشستیں خالی کرنے کی پیش کش کی تاکہ جناح مجلس قانون ساز کے رکن بن سکیں۔ تاہم جناح نے یہ بات منظور نہ کی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں، اس وقت جب کہ جناح ابھی انگلستان ہی میں تھے، بمبئی کے مسلمانوں نے انہیں مرکزی اسمبلی کیلئے بلا مقابلہ منتخب کر لیا۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں جب نئی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو انہیں اسمبلی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قائد منتخب کیا گیا۔ اس پارٹی میں زیادہ تر مسلمان شامل تھے۔ مرکزی اسمبلی میں اراکین کی تعداد کے اعتبار سے یہ پارٹی کانگریس کے بعد دوسرے نمبر پر تھی۔

اس دور میں اسلامیانِ ہند نے جناح پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جو توقعات ان سے وابستہ کی تھیں وہ ان پر کما حقہٗ پورے اترے۔ فروری ۱۹۳۵ء میں انہوں نے قانونی اور پارلیمانی امور میں اپنی بے مثل اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر نہ صرف ایک سرکاری تحریک کو ناکام بنا دیا بلکہ جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ میں کانگریس کی تجویز کردہ ترامیم سے متعلق ایک تحریک کو بھی ناکام بنا دیا۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے قائد کی حیثیت سے انہوں نے اسمبلی سے کمیونل ایوارڈ بھی منظور کرا لیا۔ (”یہ منظوری اس وقت تک کے لئے تھی جب تک کہ متعلقہ مختلف فرقے اس کے کسی متبادل نظام پر متفق نہ ہو جائیں۔“) انہوں نے صوبائی انتظام میں تبدیلیاں بھی تجویز کیں۔ جبکہ وفاقی

انتظام کو یکسر مسترد کر دیا۔ ("جو مکمل طور پر خراب تھا اور بنیادی طور پر
ناقابلِ قبول تھا۔")ایوان میں ایک ایسی پارٹی کے قائد کی حیثیت سے، جس
کے اراکین کی تعداد ایک سو ستائیس میں سے صرف بائیس تھی، یہ کامیابی ہی
اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ بساطِ سیاست کے کتنے بڑے ماہر تھے
اور سیاست کے کھیل میں وہ اپنی ذہانت، گہرے ادراک اور قوت استدلال
سے کثیر تعداد حریفوں کو کتنی آسانی سے شکست دے دیتے تھے۔

مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ

۱۹۳۴ تا ۱۹۴۰

جناح نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے کام کا آغاز، سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں برطانیہ سے واپس آ کر کیا۔ یہ کام کچھ اتنا آسان نہ تھا۔ لیگ کی بے عملی کا عالم یہ تھا کہ گزشتہ چند برسوں سے اس کے سالانہ اجلاس بھی مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی ہلچل یا دلچسپی پیدا کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ پھر ان میں حاضری بھی اتنی کم ہوتی تھی کہ مجبوراً کورم کو بھی ۷۵ سے ۵۰ کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں بنیادی سطح پر نہ تو اس کی کوئی تنظیم تھی نہ اس کے ادارے موجود تھے۔ عالم یہ تھا کہ اس کی صوبائی شاخوں کا "وجود بھی صرف کاغذ" کی حد تک محدود تھا۔ یہ کاغذی شاخیں بھی قطعی غیر مؤثر اور غیر فعال تھیں۔ ان پر مرکز کا کنٹرول بھی برائے نام تھا۔ خود مرکزی سطح پر لیگ کے پاس کوئی واضح سیاسی پروگرام یا جامع دستور العمل نہ تھا۔ تا آنکہ بمبئی (اپریل ۱۹۳۶ء) سیشن منعقد نہ ہوا جس کا اہتمام جناح نے سر سید وزیر حسن کی زیر صدارت کیا تھا۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ صوبائی سطح پر لیگ کا وجود ایک عجیب گورکھ دھندا بن گیا تھا۔ مختلف مسلم لیڈروں نے صوبائی پارٹیاں قائم کر لی تھیں۔ ان لیڈروں کا مقصد صرف ذاتی اغراض کی تکمیل اور اپنی لیڈری چمکانا تھا۔ غرض کل ہند

سطح پر مسلم سیاست بڑی ناگفتہ بہ صورت حال سے دو چار تھی۔ اس کے نقوش غیر واضح اور مسخ شدہ تھے۔ اگرچہ ان لیڈروں کی تمام سرگرمیوں کا مقصد و منتہی ایک ہی تھا، تاہم سیاسی اعتبار سے ان لیڈروں اور پارٹیوں کو تین مختلف لیکن واضح گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی برطانیہ کے حامی، کانگریس سے وابستہ اور آزاد۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ کانگریس ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے خلاف پہلے ہی نہایت زور شور سے اپنی مہم شروع کر چکی تھی۔ وہ اس بنیادی مقصد کے تحت انتخابات میں حصہ لے رہی تھی کہ اسمبلی میں پہنچ کر اندر سے آئین کا تیا پانچہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف انگریز تھے جو ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کو اپنا بہت بڑا کارنامہ تصور کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی سنجیدگی سے ان پر عملدرآمد شروع کر دیں۔ چنانچہ انگریزوں کے نقطۂ نظر سے جہاں کانگریس کا رویہ ان کے لئے مایوس کن تھا وہیں جناح کی طرف سے ان اصلاحات پر کڑی نکتہ چینی بھی ان کے لئے کچھ کم حوصلہ شکن نہ تھی۔ پھر یہ کہ وہ جناح کے ماضی سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جناح ہمیشہ کانگریس کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے انہیں اب بھی یہی نظر آ رہا تھا کہ مسلمان ایک مرتبہ پھر جناح کے زیرِ اثر ان اصلاحات کے سلسلے میں کانگریس جیسا رویّہ اختیار کریں گے۔ جناح ایک عشرہ قبل بھی کانگریس کے تعاون سے سائمن کمیشن کی کمر توڑنے کی کوشش کر چکے تھے۔ اس لئے انگریزوں کو جناح کی ان تمام کوششوں پر بجا طور پر تشویش تھی جو وہ کل ہند بنیاد پر ایک مسلم دستور العمل کی تیاری کے لئے کر رہے تھے کیونکہ جناح کی کامیابی کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ مسلمانوں کی صوبائی قیادت بھی ان اصلاحات کی مخالفت کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس مرحلے پر انگریزوں کے حامی مسلم لیڈروں نے جناح سے کیوں تعاون نہیں کیا تھا۔ ان میں پنجاب کے سر فضل حسین، یوپی کے سر احمد سعید خان نواب آف چھتاری (۱۸۸۲ تا ۱۹۸۲) سر شفاعت احمد خان (۱۸۹۳ تا ۱۹۴۷) اور سر محمد یوسف، سندھ کے سر غلام حسین ہدایت اللہ (۱۸۷۹ تا ۱۹۴۸) اور سیٹھ عبداللہ ہارون (۱۸۷۲ تا ۱۹۴۲) اور سرحد کے سر عبدالقیوم (۱۸۶۶ تا ۱۹۳۷) شامل تھے۔ یہ تمام حضرات بڑی حد تک برطانوی افسروں کے زیرِ اثر تھے۔

مزید براں ہندوستان کی مسلم سیاست میں جناح کی نئے سرے سے آمد کی وجہ سے، حالات نے جو رُخ اختیار کیا تھا اس پر آغا خان بھی چونک گئے تھے۔ آغا خان کی خواہش بھی یہی تھی کہ مسلمان نئی اصلاحات قبول کر لیں۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں برطانیہ کے حامی مسلم رہنماؤں سے مراسلت میں مصروف تھے اور ہارون، یوسف، چھتاری اور دیگر لیڈروں پر زور دے رہے تھے کہ وہ سب وہی پالیسی اختیار کریں جو فضل حسین نے پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کی تنظیمِ نو کر کے، اختیار کی ہے۔ وہ ان لوگوں کو تلقین کر رہے تھے کہ برطانیہ کی حمایت کی پالیسی اختیار کر کے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کی تیاری کریں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے سر فضل حسین کے اصرار پر فروری ۱۹۳۶ء میں دہلی کے مقام پر ہونے والی آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انتظامی بورڈ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی حالانکہ ان کا یہ اقدام ایک طرح سے مسلم لیگ کو زک اور نقصان پہنچانے کے مترادف تھا۔ یہ وہی مسلم لیگ تھی جسے جناح کی قیادت میں متحد کرنے کے لئے ۱۹۳۴ء میں خود انہوں نے بھی بہت کوششیں کی تھیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں آغا خان نے کس بنا پر سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کی مالی امداد کی تھی اور

جناح کی مسلم لیگ کی مالی اعانت سے کیوں ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔

یہ سب وہ لوگ تھے جن کے بارے میں خود جناح کچھ اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا: "یہ سب بے ہمت اور بزدل لوگ، مجھ سے خواہ کچھ ہی وعدے کیوں نہ کریں، ڈپٹی کمشنر سے یہ ضرور یہ دریافت کرتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔" اس کے باوجود بھی جناح نے ان لوگوں کو مسلم لیگ کے حلقے میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خواہ اس کا مقصد ایک متحد مسلم پارٹی اور ایک متحدہ ملی دستور العمل بنانا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ چنانچہ انہوں نے فضل حسین کو ان کی انا کی تسکین کے لئے جنوری ۱۹۳۶ء میں ہونے والے مسلم لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کی پیش کش کی اور اس پر آمادہ کرنے کے لئے انہوں نے فضل حسین کی ضرورت سے زیادہ تعریف بھی کر ڈالی۔

لیکن جناح کی ان تمام درخواستوں کو سر فضل حسین نے نہایت رعونت سے ٹھکرا دیا اور جناح کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ پنجاب کے معاملات میں اپنی ٹانگ نہ اڑائیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں (اور آغا خان) کی شہ پر اپنی اس یونینسٹ پارٹی کو پھر سے فعال بنانے اور اس کی تنظیم نو پر تلے ہوئے تھے۔ جس کا مقصد صرف جاٹ اور راجپوت ذاتوں سے تعلق رکھنے والے زمینداروں اور کاشتکاروں کے مفادات کے لئے کام کرنا تھا۔

اسی طرح کانگریس کے حامی مسلمانوں کو رام کرنے میں بھی جناح کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ کانگریس کے سرگرم حامی "خان برادران" نے تو ان کے ساتھ نہایت سرد مہری کا سلوک کیا۔ جن کی پارٹی خدائی خدمت گار (سرخ پوش تحریک) ۱۹۳۱ء سے کانگریس کے حلقہ اثر میں جا چکی تھی۔

دوسری طرف مسلمانوں کی دیگر صوبائی جماعتیں بھی جناح کے لئے کچھ کم درد

سرنہیں تھیں۔ یہ تمام جماعتیں خالصتہً ذاتی، گروہی اور علاقائی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم تھیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کی حریف بھی تھیں۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے (۱۸۷۳تا ۱۹۶۲) نے کرشک سمیتی پارٹی بنالی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی تھی کہ وہ مولانا اکرم خان (۱۸۶۹ تا ۱۹۶۸) کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی اور پریذیڈنسی مسلم لیگ کے ساتھ مل کر پراونشیل پارلیمنٹری بورڈ میں کام کریں گے، لیکن آخری لمحے میں فضل الحق اس وعدے سے انحراف کر گئے۔

بنگال کا ہمسایہ صوبہ آسام چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ حد یہ ہے کہ لیگ بھی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ سندھ تین پارٹیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ۱۔ ہارون کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی (جو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے خطوط پر تشکیل دی گئی تھی)، ۲۔ خلافت کانفرنس کے ملبے پر قائم ہونے والی شیخ عبدالمجید سندھی کی آزاد پارٹی اور ۳۔ ہدایت اللہ (۱۸۷۹ تا ۱۹۴۸) کی مسلم پولٹیکل پارٹی۔ سرحد کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ اس صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب (۱۸۸۲ تا ۱۹۵۸) کی پارٹی یعنی خدائی خدمت گار، سر عبدالقیوم کی یونائیٹڈ مسلم نیشلسٹ پارٹی کے علاوہ مسلمانوں کے تین اور چھوٹے چھوٹے گروپ بھی موجود تھے۔ بہار میں سید عبدالعزیز (۱۸۸۵ تا ۱۹۴۹) انتہائی محترم اور معتبر مسلم رہنما سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی یونائیٹڈ مسلم پارٹی کے نسبت سے پارلیمانی بورڈ میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ سی پی میں رؤف شاہ نے اپنے تیرہ دیگر ساتھیوں کے ساتھ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی رکنیت سے محض ذاتی وجوہ کی بنا پر استعفادے کر انتخابات میں حصہ لینے کے لئے اپنی مسلم پارلیمنٹری پارٹی بنا لی تھی۔ اسی طرح چوہدری عبدالحکیم نے مدراس پریذیڈنسی مسلم پروگریسو پارٹی

کی بنیاد ڈال لی تھی ۔ احرار مسلم لیگ سے اس لئے دور رہتے تھے کہ مسلم لیگ میں قادیانیوں کی رکنیت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جب کہ مولانا ظفر علی خان نے (۳، ۷، ۸ آتا ۱۹۵۶) اور ان کی پارٹی اتحادِ ملّت نے اس بنیاد پر تعاون سے انکار کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کے دروازے احراروں پر بند نہ تھے۔

بہر حال ان مسلم رہنماؤں میں سے بیشتر بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ لہٰذا ان کے بارے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس مرحلے پر ان کی جانب سے یہ رویہ اختیار کرنے کے کیا عوامل تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہی برطانوی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ابتدائی طور پر صوبوں میں حکومتِ خود اختیاری کو فروغ دیا جائے گا۔ برطانوی حکومت کا یہ ایسا فیصلہ تھا جس نے ان سیاستدانوں کے لئے جو صوبائی سیاست کے محدود دائرے میں سرگرمِ عمل تھے۔ آگے بڑھنے اور کامیابیوں کے نئے باب وا کر دیئے تھے۔ اسی بنا پر وہ اب صوبائی سطح پر زیادہ سرگرم حصہ لے کر اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی حکومت کیونکہ صوبائی خود مختاری کے فوری طور پر نفاذ پر زور دے رہی تھی جبکہ دوسری طرف وفاق کی تشکیل ایک غیر یقینی مستقبل تک مؤخر ہو گئی تھی۔ (کیونکہ اس کی تشکیل بعض ایسی شرائط سے وابستہ تھی جن کی تکمیل اس وقت کے حالات میں ممکن دکھائی نہ دیتی تھی۔) بنابریں ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بھی سیاست کو صوبوں تک محدود کرنے کا ذریعہ بن گیا تھا اور اس کی بنا پر صرف صوبوں میں اقتدار حاصل کرنے والے لوگ ہی فوری انعام اور صلے سے متمتع ہو سکتے تھے۔ یہ دوسرا سبب تھا جس کی بنا پر لیگ سے تعاون میں ان لیڈروں کو تامل تھا۔ مزید براں جس طرح اچانک اور غیر متوقع طور پر لیگ جس طرح انتشار و افتراق کا شکار ہوئی تھی اور جس حیرت انگیز طریقے سے آل پارٹیز مسلم کانفرنس (۱۹۲۹) کو عروج ہوا تھا اس کی بنا پر وہ

لیگ کی طرف سے بد اعتمادی کا بھی شکار تھے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ مسلم کانفرنس کبھی اسلامیانِ ہند میں نہ تو جڑیں پکڑ سکی اور نہ ہی اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لیگ کا متبادل بن سکتی۔ حالانکہ لیگ پر اس دور میں نزع کا عالم طاری تھا۔ اگرچہ مسلم لیگ مئی ۱۹۳۴ء میں پھر سے متحد ہو گئی تھی لیکن اسے اپنے طور پر انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے میں مزید دو برس کا عرصہ لگا۔ مسلم لیگ کے بارے میں اس رویے کے باوجود تمام صوبائی لیڈروں نے اپنی ذاتی رنجشوں اور مخالفتوں، صوبائی آویزشوں اور بدگمانیوں اور راتوں رات سیاسی فوائد حاصل کرنے کی اس شدید خواہش کے باوجود، جو اُن کے رویوں، اقدامات اور فیصلوں کا تعین کرتی تھی، مسلمانوں کے حقوق اور کمیونل ایوارڈ کی حمایت جاری رکھی۔ ان کی یہ پالیسی ایک طرح سے مسلم لیگ کی پالیسی کے قریب تر اور کم و بیش اس سے ہم آہنگ تھی۔

اس انتہائی حوصلہ شکن صورتِ حال میں جناح کے لئے واحد حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس مرحلے پر اسلام کے فلسفی شاعر علامہ اقبال (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸) ان کا نہایت عزم و استقامت سے ساتھ دے رہے تھے۔ انہوں نے پس منظر میں رہتے ہوئے ہندوستانی سیاست کی راہ متعین کرنے میں جناح کی مدد کی۔ جناح نے جو ان عظیم لوگوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی کبھی مایوس ہونا اور امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں سیکھا تھا، اقبال کے اصرار پر فوراً ہی ملک کا دورہ کیا۔ اس دورے میں انہوں نے صوبائی مسلم رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ اپنے اختلافات ختم کر کے مسلم کاز کے لئے سرگرم عمل ہوں اور مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں انہوں نے مسلم عوام کو پر زور الفاظ میں متحد اور منظم ہونے اور مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے کی تلقین کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اتحاد اور تنظیم کی راہ دکھائی، گورنمنٹ آف

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو مربوط بنا کر اور مقصدیت عطا کر کے، ایک آہنگ بھی دیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وفاقی سطح پر جو اعلان کیا گیا ہے وہ قلم زد کر دیا جائے کیونکہ یہ انتظام مکمل اور ذمہ دار حکومت کے قیام سے متعلق ہندوستان کی خواہشات کے قطعی منافی تھا۔ البتہ انہوں نے صوبائی اسکیم کو، اس کے باوجود کہ بعض قابلِ اعتراض پہلو بھی تھے، اس پر بروئے کار لانے پر زور دیا کہ اس اسکیم میں پہلی مرتبہ صوبائی خودمختاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں جناح نے ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات کے لئے لیگ کا ایک قابلِ عمل منشور بھی ترتیب دیا۔ یوں لگتا ہے، گویا اس زمانے میں جناح کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ جو وقت ضائع ہو چکا ہے اس کی تلافی کرتے ہوئے کم سے کم عرصے میں مسلم ہند کو ایک ایسی قوت اور طاقت بنا دیا جائے جسے تسلیم کرنا ہر مخالف اور حریف کی مجبوری بن جائے۔

جناح کی ان تمام کوششوں کے باوجود ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں لیگ کو مختلف النوع اور بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کی صفوں میں جو نفسا نفسی، انتشار اور افتراق تھا اس سے پیدا ہونے والی مشکلات اس بنا پر اور بھی گھمبیر ہو گئی تھیں کہ خود لیگ میں بھی ابھی تنظیمی سطح پر کمزوریاں موجود تھیں اسے انتخابات کا تجربہ نہ تھا۔ اس کے مالی وسائل بہت محدود اور کم تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس اپنا کوئی اخبار بھی نہ تھا جو اس کے نصب العین کی ترجمانی اور اس کے امیدواروں کی حمایت کرتا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود لیگ نے کل ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۱۰۸ نشستوں (یعنی ۲۴.۲ فیصد) پر کامیابی حاصل کی۔ یہاں اہمیت اس بات کی نہیں کہ مسلم لیگ کی کامیابی مایوس کن تھی۔ اصل اور قابلِ غور امر یہ ہے کہ بہرحال مسلم لیگ نے مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود

اتنی نشستیں حاصل کر لی تھیں اور ایسی صورت میں کہ کل ہند بنیادوں پر اوّل تو مسلم لیگ کے انتخاب میں حصہ لینے کا یہ پہلا موقع تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے چار صوبے (سرحد، سندھ، بہار اور آڑیسہ) ایسے تھے، جہاں لیگ نہ تو پارلیمانی بورڈ ہی قائم کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور نہ ان صوبوں میں اپنا کوئی امیدوار ہی کھڑا کر سکی تھی۔ جب کہ دوسرے صوبوں میں بھی مسلم لیگ تمام نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے نہ کر سکی۔ کیونکہ اسے مناسب امیدوار نہیں مل سکے تھے مثال کے طور پر پنجاب میں مسلم لیگ نے صرف سات نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے جن میں سے دو کامیاب ہوئے۔ یوپی کی کل ۶۴ مسلم نشستوں میں سے صرف ۳۵ پر اس نے اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے جن میں سے ۲۹ جیت گئے۔ مدراس کی کل ۲۹ نشستوں میں اس نے گیارہ پر انتخاب لڑا اور دس نشستیں حاصل کیں۔

تاہم لیگ کی یہ محدود کامیابی دو اہم عوامل کی بنا پر قابلِ توجہ اور قابلِ لحاظ تھی۔ اوّل یہ کہ ان انتخابات کے نتائج نے کانگریس کے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا تھا کہ وہ اسلامیانِ ہند کی بھی ترجمان ہے۔ کیونکہ عام نشستوں پر زبردست کامیابی کے باوجود (کانگریس نے ۱۵۸۵ عام نشستوں میں سے ۷۱۱ نشستیں حاصل کی تھیں۔) وہ صرف ۲۶ مسلم نشستیں حاصل کر سکی تھی اور ان ۲۶ میں سے ۱۹ نشستیں اسے سرحد میں حاصل ہوئی تھیں جہاں اس نے سرخپوش تحریک سے اتحاد کر رکھا تھا۔ مزید براں ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں کے مسلم انتخابی حلقوں میں ایک بھی کانگریسی منتخب نہیں ہو سکا تھا۔ ان آٹھ صوبوں میں پنجاب، سندھ، بنگال، آسام، یوپی، سی پی، آڑیسہ اور بمبئی شامل تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم اور نمایاں بات یہ تھی کہ تین بڑے مسلم اکثریتی صوبوں یعنی پنجاب، سندھ اور بنگال میں سے کسی صوبے میں کانگریس ایک بھی مسلم نشست حاصل نہیں کر سکی تھی۔ بنا بریں یوپی

میں بھی اسے کوئی مسلم نشست نہیں مل سکی تھی۔ جو بھارتی سیاست ہی میں نہیں بلکہ مسلم سیاست میں بھی مرکزی اور کلیدی حیثیت رکھنے والے صوبے کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ دوسرا نمایاں پہلو یہ تھا کہ مسلم صوبوں میں سب سے کثیر آبادی والے صوبے بنگال کی ۱۱۹ مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ نے ۵۰ نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں اسے ایک تہائی مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ جب کہ بحیثیت مجموعی مسلم لیگ نے جتنی نشستوں پر انتخاب میں حصہ لیا تھا ان میں سے ۶۰ سے ۷۰ فی صد نشستیں اسے حاصل ہوئی تھیں۔ باقی مسلم نشستوں پر یا تو آزاد مسلم امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ یا وہ صوبائی پارٹیاں جو بالعموم مسلم حقوق و مفادات کے تحفظ کی مدعی تھیں۔ اس طرح نشستوں کی تعداد کے اعتبار سے اگر ان انتخابات کے نتائج کو مسلم لیگ کے لئے مایوس کن تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان انتخابات میں اسلامیانِ ہند نے عملاً نہایت زبردست اور مؤثر طریقے سے ان مسلم جذبات اور خواہشات کی حمایت کر دی تھی جو مسلم لیگ کی سیاسی حکمت عملی کا محور اور مرکز تھے۔ چنانچہ اس پہلو سے اگر تجزیہ کیا جائے تو انتخابات کے نتائج مسلم لیگ کے لئے باعث اطمینان بھی تھے۔

یہی سبب تھا کہ جناح انتخابی نتائج سے قطعی مایوس نہ تھے اور نہ ان کے حوصلے اور عزائم پست ہوئے تھے۔ اس کے کئی معقول اسباب تھے۔ ان کے نزدیک سب سے زبردست کامیابی تو یہی تھی کہ مسلمانوں نے کانگریس اور اس کی قیادت کو اپنا ترجمان ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا بلا واسطہ مطلب یہی تھا کہ مسلم لیگ کے سوا ہندوستان میں کوئی اور پارٹی اس بات کا دعوٰی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے اسلامیانِ ہند کی حمایت حاصل ہے۔

دوسری جانب گویا ان انتخابات کے ذریعے صوبائی سطح پر کام کرنے والی

بشیعر مسلم جماعتوں اور آزاد امیدواروں نے اپنے محدود صوبائی دائرۂ عمل میں مسلم حقوق کی حمایت اور ان کے تحفظ کے لئے کام کرنے کا اعلان کیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ یہ جماعتیں اور رہنما ابھی تک مسلمانوں کے لئے کل ہند بنیاد پر ایک مربوط پالیسی کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے قاصر تھے۔ اگرچہ ان انتخابات میں لیگ کے امیدواروں کا مقابلہ انہی مسلم پارٹیوں اور افراد سے تھا لیکن جناح نے اس مرحلے پر بھی نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا اور کوشش یہی کی کہ یہ اختلافات اتنے شدید اور گہرے نہ ہونے پائیں کہ واپسی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ جناح ایک نہایت زیرک اور ہوشیار سیاست دان تھے۔ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے اور ان کے مطابق اپنا طریق کار متعین کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کب اور کہاں انہیں کیا ضرب لگانی ہے، کب خاموشی اختیار کرنی ہے اور کب پیش قدمی کرنی ہے۔ انہی مصلحتوں اور تقاضوں کے پیش نظر جناح نے انتخابات کے موقع پر یا اس کے بعد ان مسلم پارٹیوں اور رہنماؤں کے خلاف کوئی منظم یا تند و تیز مہم شروع کرنے سے گریز کیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس پر نہ تو نکتہ چینی کی اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ساتھ ہی انہوں نے ایسے مسلم لیگی ارکان کو بھی پارٹی سے برطرف نہیں کیا۔ جنہوں نے لیگ کی بجائے کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

الیکشن کے بعد جناح نے ان تمام پارٹیوں اور افراد کو لیگ کی طرف رجوع کرنے کے لئے دو جہتوں میں کوششیں شروع کیں۔ ایک طرف انہوں نے ہندوستانی سیاست کی مثلث میں مسلم لیگ کو اس بنا پر تیسرے فریق کی حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ہندوستانی سیاست میں مسلم تشخص کی علامت ہے اور کانگریس کے مقابلے میں مسلم خواہشات اور امنگوں کی تکمیل اور مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے

پوری طرح واقف ہے۔ دوسری طرف انہوں نے ان آزاد مسلم امیدواروں اور چھوٹے گروپوں کو لیگ میں شامل ہونے کی دعوت اور ترغیب دی جو کسی مخصوص اندازِ فکر سے وابستہ نہ تھے۔ مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسی قوت بنا دیا جائے جسے کوئی بھی نظر انداز نہ کر سکے۔ انہوں نے ان افراد اور گروپوں کو اچھی طرح باور کرا دیا کہ صرف مسلم لیگ جیسی متحدہ کل ہند مسلم جماعت ہی کو کانگریس اور انگریزوں سے مساویانہ حیثیت کے لئے مذاکرات کرنے کا اختیار اور حق حاصل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ان سب کو اس امر پر بھی قائل کرنے کی کوشش کی کہ برابر کے اور ہم پلّہ فریقوں کے درمیان ہی ایک آبرومندانہ سمجھوتہ طے پا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول، یعنی اسلامیان ہند کو انگریزوں اور ہندوؤں کا ہمسر بنانے کے لئے لازمی ہے کہ لیگ کو مضبوط اور مستحکم بنایا جائے جو واحد مسلم کل ہند جماعت ہے۔ جناح نے انہیں یہ بھی تلقین کی کہ اس اعلیٰ تر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام گروہی، قبائلی، مقامی اور صوبائی مفادات کو مسلمانوں کے کل ہند مفادات کا تابع بنا دیں۔ جناح اور اسلامیانِ ہند کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دور میں کانگریس نے کھل کر ہندو مسلم اکثریتی صوبوں میں غیر کانگریسی گروپوں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانے اور انہیں اپنے حلقۂ اثر میں شامل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ کانگریس کی اس پالیسی کا اصل ہدف مسلمان تھے۔ یوں جناح کی ان کوششوں کی مقصدیت بھی ان لوگوں اور گروپوں پر مزید واضح ہو گئی کیونکہ وہ مسلمانوں کو قبل از وقت ہی کانگریس کے ان عزائم سے بار بار خبردار کر چکے تھے۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات سے قبل اور اس کے دوران کانگریس، لیگ مفاہمت کے امکانات کافی روشن نظر آتے تھے اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مرکزی اسمبلی میں آزاد پارٹی

کے قائد کی حیثیت سے جناح نے حکومت کے کئی اقدامات کو ناکام بنانے کے لئے مجلس قانون ساز میں کانگریس سے تعاون کیا تھا اس طرح مرکز میں انہوں نے ہندو مسلم معاونت کی جو فضا قائم کی تھی اس کا دائرہ کار اب وہ صوبائی سطح تک بڑھانے کے خواہشمند تھے۔ لیگ، کانگریس مفاہمت کے امکانات روشن ہونے کا دوسرا سبب بقول ایک کانگریسی مؤرخ سیتا رامیہ یہ تھا کہ کانگریس نے انتخابات کے دوران لیگ کے تعاون سے کام کیا۔ درحقیقت دونوں پارٹیوں میں یہ واضح مفاہمت موجود تھی کہ انگریز حکومت کی حامی انتخابی جماعتوں کے خلاف مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں امیدوار کھڑے نہیں کریں گی۔ یہ بات بالخصوص یوپی کے معاملے میں بالکل درست تھی جو ہندوستانی سیاست میں مرکزی صوبے کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ عام خیال یہی تھا کہ انتخابات کے بعد بھی کانگریس لیگ تعاون (بالخصوص یوپی میں) جاری رہے گا۔ یہی وہ تمام اسباب تھے جنہوں نے اس خیال کو بھی تقویت پہنچائی کہ انتخابات کے بعد ایک مخلوط حکومت قائم ہوگی۔

چنانچہ اس مرحلے پر مسلم لیگ نے اپنے طور پر خیر سگالی کا ایک اور مظاہرہ بھی کیا۔ حالانکہ ان حالات میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ جب کانگریس نے، گورنروں کے خصوصی اختیارات پر اپنے اعتراضات دور ہونے تک، ایسے صوبوں میں جہاں اسے اکثریت حاصل تھی وزارتیں قائم کرنے سے انکار کر دیا تو جناح نے اس اقدام کی حمایت میں مجلس قانون ساز میں شامل لیگ کے اراکین کو عبوری حکومت میں شامل نہ ہونے کی ہدایت کی۔ یاد رہے کہ عبوری حکومتیں اپریل ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں جناح نے بمبئی اسمبلی میں لیگ کے اراکین کو ہدایت کی کہ وہ کوپر کی عبوری وزارت کیخلاف تحریک عدم اعتماد کی حمایت کریں تاکہ کانگریسی وزارت کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس کے برعکس کانگریس کا عالم یہ تھا کہ اختلافی نکات پر

جب وائسرائے سے اس کا سمجھوتہ ہو گیا تو اس نے مسلم لیگ کی جانب سے تعاون کی پیش کش کی بنیاد پر مخلوط حکومتیں قائم کرنے کے خیال کو یکسر مسترد کر دیا۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے جو مختلف ثقافتوں اور قومیتوں کا گہوارہ تھا، سوئٹزرلینڈ کا نظام حکومت ہی ایسا مثالی نمونہ بن سکتا تھا، جس میں فیصلہ کرنے کے عمل میں اہم فرقوں کو نمائندگی حاصل ہوتی لیکن کانگریس نے اس کے برعکس برطانوی نظام حکومت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جو صرف انگلستان جیسے ملک کے لئے ہی موزوں اور مناسب ہو سکتا تھا۔ جہاں صرف ایک قوم آباد ہے یوں کانگریس سختی کے ساتھ اکثریتی راج کے اصول پر عمل پیرا ہونے کے لئے تل گئی ۔ اس نے مسلم اور دیگر اقلیتوں پر خالص کانگریسی وزارتیں مسلّط کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانگریسی منافقت اور دو عملی اس حقیقت سے بھی عیاں تھی کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال جیسے ہندو اقلیتی صوبوں میں تو اس بنیاد پر کہ ہندوستان میں مختلف قومیں آباد ہیں وہ مخلوط حکومتیں قائم کرنا چاہتی تھی لیکن ہندو اکثریتی صوبوں میں وہ ہندوستان کی کثیر قومی حیثیت کے اس اصول کو فراموش کر کے صرف ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنے پر مصر تھی۔ کوپلینڈ کا کہنا ہے کہ

> ''کانگریس کے نزدیک تمام غیر کانگریسی صوبوں میں تو اقلیتی رائے عامہ کو اہمیت حاصل تھی لیکن ہندو صوبوں میں معاملہ بالکل الٹ تھا۔ یہاں اس کے نزدیک مخلوط حکومتوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہاں اقلیتوں کو کوئی اہمیت یا حیثیت حاصل نہ تھی۔''

پنڈرال مون کے بقول ہندو تخت اقتدار پر صرف ان مسلمانوں کو شریک کرنے پر تیار تھے جو خود کو بنیادی طور پر ہندو تنظیم میں ضم کر چکے تھے۔ مثال کے طور پر یو۔پی

میں کانگریس نے لیگ کو اقتدار میں شامل ہونے کی پیش کش نہیں کی بلکہ اسے کانگریس میں ضم ہو جانے کے لئے کہا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ مسلمانوں کی اس واحد کل ہند جماعت کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح کانگریس زیادہ طاقتور ہو کر چھوٹے چھوٹے صوبائی گروہوں سے جس طرح چاہے نمٹ سکے اور معاملت کر سکے۔ کانگریس کی یہ حکمتِ عملی خود اس کے لئے الٹی پڑ گئی اور اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا اسے نقصان ہی پہنچا۔ مسلمان چوکنا اور ہوشیار ہو گئے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یوپی میں کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا ہے اگر وہ اس کی عام سیاسی حکمت عملی کا ایک نمونہ ہے تو پھر پورے ہندوستان کے لئے قائم ہونے والی وفاقی حکومت میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کانگریس اور اس کے کاسہ لیسوں کے سوا تختِ اقتدار پر کسی کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

چنانچہ اس مرحلے پر ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچنا پڑا کہ کانگریس کی اس روش اور ذہنیت کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ جو سراسر مسلمانوں کے خلاف اور ان کے مفادات کے منافی تھی۔ اس رویے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اقلیتوں کے بارے میں بالعموم اور مسلمانوں کے بارے میں بالخصوص کانگریس جس پالیسی کو اختیار کرنا چاہتی ہے اس کی بنیاد آمریت پر ہے اور وہ انہیں مغلوب کر کے اپنا غلام اور مطیع بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے کانگریس کا یہ رویّہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ چنانچہ مسلمان فطری طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی محاذ پر اپنی قوت کو مجتمع کر کے ثابت کر دیں کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت ہندوؤں سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ وہ ہر اعتبار سے ان کے برابر، ہم پلّہ اور ہمسر ہیں مسلمانوں پر یہ حقیقت خوب اچھی طرح واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایک برابر کے فریق کی حیثیت

سے صرف اسی صورت میں ہندوؤں سے بات کر سکتے ہیں جب وہ ہندوؤں کی طرح کانگریس کے مقابلے میں ایک کُل ہند جماعت کے پرچم تلے متحد ہوں، ان کی بھی ایک ایسی کُل ہند نمائندہ جماعت ہو جو نہایت اعتماد، وثوق اور مکمل اختیار کے ساتھ ان کی نمائندگی اور ترجمانی کر سکے اور ان کے مطالبات کو نہایت قوت کے ساتھ موثر انداز میں پیش کر سکے۔ مسلمانوں کے اندازِ فکر میں اسی تبدیلی اور دوسری طرف اسلامیانِ ہند کے اتحاد کے لئے جناح کی ترغیب اور اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی صوبوں کے ایسے مسلم رہنما جو صرف ایک برس قبل تک اپنی پارٹیوں کو لیگ میں ضم کرنے پر آمادہ نہ تھے لیگ کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ان میں جو لوگ انتہائی ممتاز اور نمایاں تھے ان میں سر سکندر حیات خان (۱۸۹۲ تا ۱۹۴۲) فضل الحق اور سر محمد سعد اللہ (۱۸۸۶ تا ۱۹۵۰) شامل تھے۔ یہ حضرات علی الترتیب پنجاب، بنگال اور آسام کے وزرائے اعلیٰ تھے۔ ان تمام صوبائی سربراہوں نے اپنے پیروکاروں سمیت لیگ کے لکھنؤ سیشن (اکتوبر ۱۹۳۷) میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

مسلم لیگ میں ان لوگوں کی شرکت اور شمولیت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس سے نہ صرف لیگ کو بڑی تقویت ملی بلکہ اس کی ساکھ اور وقار میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔ اسی طرح مسلم لیگ کی کُل ہند حیثیت میں جو کمی تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ ان حضرات کے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی بنا پر مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کو وہی فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو کانگریس کو ہندو اکثریتی صوبوں میں حاصل تھی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ، مسلم اقلیتی صوبوں میں ٹھوس بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نئی تبدیلی کے بعد وہ صحیح معنوں میں ہندوستان

کی کل ہند مسلم جماعت بن گئی۔ تاریخی تناظر میں اور مطالبۂ پاکستان کے سیاق و سباق میں جو جناح تین برس بعد کرنے والے تھے، مسلمانوں کے اجتماعی رویے اور اندازِ فکر میں یہ تبدیلی اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ان رہنماؤں کے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے ساتھ ہی مسلم اکثریتی صوبوں کے عوام میں جناح نے اپنی وہ زبردست مہم شروع کی جس کے نتیجہ میں نہ صرف ان صوبوں کے عوام ان کے حلقۂ اثر میں آ گئے بلکہ بیشتر مسلم رہنما بھی ان کے ساتھ آ ملے اور لیگ میں شامل ہو گئے۔

اسی بنا پر لیگ کے لکھنؤ سیشن کو نہ صرف جدید مسلم ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ قرار دیا جاتا ہے بلکہ یہ جناح کی طویل سیاسی زندگی کا ایک اہم ترین سنگ میل بھی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے جناح اور مسلم لیگ، دونوں نے عوامی سیاست میں بیک وقت داخل ہونے کا اعلان کیا۔

ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں اس مرحلے پر وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ تھا کہ عوام کو جمہوری عمل میں براہِ راست شریک کیا جائے۔ مستقبل کے پروگرام اور مقاصد پر مسلمانوں میں اتحاد اور اتفاق رائے پیدا کیا جائے اور مسلمان قوم کو اس جدوجہد کے لئے تیار کیا جائے جو مستقبل میں اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں اور ان کے مفادات پر آئندہ چل کر فیصلہ کن ضرب لگانے کے جن عزائم کا اظہار کیا تھا، انہیں ناکام بنانے کے لئے مسلمانوں کو ذہنی، فکری، نفسیاتی اور جذباتی طور پر تیار اور منظم کر دیا جائے۔ وقت کے انہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے لیگ کو ایک حقیقی جمہوری تنظیم بنا دیا گیا۔ لیگ کی رکنیت سازی کا فیصلہ کیا گیا۔ رکنیت فیس دو آنہ (موجودہ بارہ پیسے) مقرر کی گئی۔ ہر سطح پر لیگ کی تنظیم کے لئے ایک پروگرام

بنایا گیا۔ اس پروگرام کے تحت لیگ کو صرف ڈویژنل، ڈسٹرکٹ اور وارڈ/محلہ کی سطحوں پر ہی منظم نہیں کیا گیا بلکہ قصبوں اور دیہات تک میں مسلم لیگ کی رکنیت سازی نہایت جوش وخروش سے شروع کردی گئی۔

علاوہ ازیں مسلم لیگ کے اغراض ومقاصد میں تبدیلی کی گئی۔ اب مسلمانوں کا مقصد ومنتہیٰ آزاد اور جمہوری ریاستوں کے ایک ایسے وفاق کا قیام تھا جس کے آئین میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دیگر اقلیتوں کے تمام حقوق اور مفادات کے مناسب اور موثر تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو۔ مسلم لیگ نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ ظاہری علامتیں بھی اپنالیں جو کسی سیاسی جماعت کے وجود کا اظہار ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر عوام کے ذہنوں میں اس جماعت کے اثرات گہرے طور پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور افتخار کے اظہار کے لئے مسلم لیگ سیشن کے پنڈال پر لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرایا گیا۔ والنٹیروں کی ایک نیم فوجی تنظیم قائم کی گئی جس کے ذمے سیشن کے انتظامات تھے۔ اس موقع کے لئے لیگ کا ایک نغمہ بھی بطور خاص تیار کرایا گیا تھا۔ یہ نغمہ کیا تھا ایک رجز تھا اور اس کا موضوع ''مسلمانوں کے لئے جناح کا پیغام تھا'' جس میں مسلمانوں کو لیگ کے پرچم تلے جمع اور متحد ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔

مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر متحد اور مجتمع کرنے کے لئے جناح نے جو طویل، انتھک اور تاریخی جدوجہد کی تھی۔ لکھنؤ سیشن اس کا حاصل اور منتہیٰ تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کو از سرِ نو فعال اور منظم کر کے اُسے اسلامیانِ ہند کا سیاسی ترجمان بنانے کی جو سعیٔ پیہم کی تھی یہ سیشن اس سمت پہلی واضح کامیابی تھی۔ لکھنؤ سیشن نے مسلمانوں میں جو جوش وولولہ پیدا کیا وہ اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اس کے فوری مثبت اور ٹھوس نتائج بھی برآمد

ہو گئے۔ تین ماہ کے مختصر عرصے میں دیکھتے ہی دیکھتے صرف یو۔ پی میں مسلم لیگ کی نوّے شاخیں قائم ہوئیں اور ایک لاکھ افراد نے مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی۔ لاہور واپسی کے ایک ہفتے کے اندر ہی سر سکندر حیات نے جناح کو لکھا۔

"مسلم لیگ کی رکنیت سازی تیز رفتاری سے جاری ہے۔ مجھے صوبے کے مختلف علاقوں سے بے حد حوصلہ افزا اور اطمینان بخش رپورٹیں موصول ہو رہی ہیں۔ غرض یہ کہ لکھنؤ اجلاس کی بنیاد پر پورے ہندوستان میں جو یک جہتی اور اتحاد پیدا ہوا ہے اس کا مسلم عوام نے نہایت پُرجوش انداز میں خیر مقدم کیا ہے۔"

سر سکندر حیات کے اس خط کے بعد دو ماہ کے اندر ہی پنجاب میں مسلم لیگ کی چالیس شاخیں قائم ہو گئیں۔ غرض کہ جناح نے جو حکمتِ عملی اختیار کی اس کی تکمیل کے لئے جناح نے جو مہم شروع کی اور جس صبر و استقامت کا مظاہرہ اب تک انہوں نے کیا تھا اور جو کوششیں انہوں نے کی تھیں وہ اب بار آور ثابت ہو رہی تھیں۔ مسلمان متحد ہو رہے تھے، بنیانِ مرصوص کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اور سنجیدگی کے ساتھ خود کو ہندوستانی جسدِ سیاست میں ایک مؤثر اور منفرد تیسرے فریق کی حیثیت سے ممتاز اور مستحکم کر رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے جناح کے اس اعلان کی تصدیق کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے امور میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں۔ پنڈت نہرو کے اس بلند بانگ دعوے کی تردید کر دی۔ کہ ہندوستان میں سیاسی طور پر صرف دو فریق ہیں یعنی برطانیہ اور کانگریس۔

۱۹۳۷ء کے وسط سے جو عوامل جناح کی مساعی میں کارفرما تھے۔ ان میں مسلمانوں کو اقتدار میں شریک کرنا سب سے اہم تھا۔ مسلمانانِ ہند کی حالیہ دو صد سالہ تاریخ کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے اور اس دوران اس دور کی مختلف تحریکوں کا جائزہ

لیا جائے تو ان سب میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے مسلمانوں میں اقتدار سے محرومی کا احساس جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ حقیقتاً ان سب تحریکوں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا اقتدار واپس دلایا جائے۔ چنانچہ جناح نے اجلاسِ لکھنؤ میں مسلمانوں کو اقتدار کی رفعتوں پر دوبارہ فائز کرنے کے عزم کا جو اعلان کیا تو انہوں نے ایک اعتبار سے مسلمانوں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔ مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ جناح کی شخصیت میں انہیں اپنا صحیح ترجمان مل گیا ایسا ترجمان جو ان کو اپنی تاریخ کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچانے میں رہبر کامل ثابت ہو گا۔ مسلمانوں کے اس ایقان ہی کا نتیجہ تھا کہ روز بروز جناح کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۸ء کے اوائل سے وہ اسلامیانِ ہند کے قائداعظم کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض میں مسلّم و مقبول ہوتے گئے۔

جناح کی قیادت میں لیگ کا یہ فروغ اور مسلمانوں میں اس کی مقبولیت کئی اعتبار سے نہایت شاندار اور بے مثل تھی۔ لیگ اپنی ہیئت اور قوت و طاقت کے اعتبار سے نئی بلندیاں چھو رہی تھی۔ لکھنؤ سیشن کے بعد لیگ کے اراکین کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہو رہا تھا چنانچہ اس کے بعد لیگ کے جو اجلاس ہوئے اس میں مندوبین کی بڑھتی ہوئی تعداد بھی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب ۱۹۲۳ء میں لیگ کا سیشن کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا تھا اور پھر ۱۹۳۱ء میں کورم کے لئے مندوبین کی تعداد کو ۷۵ سے کم کر کے ۵۰ کرنا پڑا تھا۔ اس کے برعکس اپریل ۱۹۳۶ء میں لیگ کے سیشن میں ۲۰۰ مندوبین نے شرکت کی جب کہ لکھنؤ کے اجلاس (۱۹۳۷ء) کے موقع پر یہ تعداد دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس اجلاس کے موقع پر پنڈال میں نشستوں کی تعداد پانچ ہزار

تھی۔ کلکتہ کے خصوصی اجلاس (اپریل ۱۹۳۸) میں پندرہ ہزار اور لاہور (۱۹۴۰) میں ساٹھ ہزار نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں شرکت کرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں ایک لاکھ سے زائد افراد شریک ہوئے تھے۔ لاہور کے اس اجلاس کو اسلامیان ہند کا سب سے بڑا اور نمائندہ اجلاس قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح لکھنؤ اجلاس کے بعد مسلم لیگ کے اراکین کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں ہندوستان بھر میں مسلم لیگ کے اراکین کی کل تعداد ۱۳۳۰ تھی لیکن ۱۹۴۱ء میں صرف مدراس میں جہاں مسلمانوں کی آبادی صرف چھ فیصد تھی، اراکین کی تعداد ۱۱۲,۰۰۰ ہو چکی تھی۔ بنگال میں ۱۹۴۴ء میں ان کی تعداد ۵۵۰,۰۰۰ ہو چکی تھی۔ یہاں یاد رہے کہ بنگال میں کانگریس سمیت کبھی کسی پارٹی کے اراکین کی تعداد اتنی نہیں رہی۔ اسی سال (۱۹۴۳-۴۴ء) میں سندھ میں مسلم لیگ کے اراکین کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی جو صوبے میں مسلمان مرد آبادی کا ۲۵ فیصد تھی۔

لیگ کی بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی قوت، طاقت اور مقبولیت کا ایک اور زیادہ قابلِ اعتماد اور مصدقہ اشارہ بعد میں ہونے والے ضمنی انتخابات سے بھی ملتا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء سے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کے درمیانی عرصے میں ۵۶ مسلم نشستوں پر ضمنی انتخابات ہوئے جن میں سے ۴۶ نشستیں (۸۲ فیصد) مسلم لیگ نے حاصل کیں جب کہ کانگریس تین نشستیں (۵ فیصد) حاصل کر سکی۔ بقیہ سات نشستوں پر آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔

مطالبۂ پاکستان اور اِس کا پس منظر

۱۹۳۸ تا ۱۹۴۰

لکھنؤ اجلاس کی شاندار کامیابی اور اس کے شاندار نتائج مرتب ہونے کے باوجود اس کے بعد کے تین برس مسلم سیاست کے ارتقا کے لئے اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں بہت اہم نازک اور تشویش ناک تھے۔ مسلمانوں کو نفسیاتی، ثقافتی سیاسی، اقتصادی غرض ہر محاذ پر مختلف چیلنج در پیش تھے۔ اگرچہ وہ ہندوستان جیسے کثیر قومی ملک میں ایک ذیلی قومی حیثیت میں رہنے کے خواہاں تھے لیکن اس سلسلے میں ان کی طرف سے جتنی بھی کوششیں ہوئیں انھیں بے سوچے سمجھے حقارت کے ساتھ نہ صرف ٹھکرایا گیا بلکہ انھیں ہر اعتبار سے ناکام بھی بنادیا گیا۔ جناح ایک طرف اگر لیگ کو ٹھوس بنیادوں پر منظم کرنے کے لئے کوشاں تھے تو دوسری طرف وہ ہندو مسلم مسئلہ کا ایک آبرومندانہ اور باوقار حل تلاش کرنے کے لئے کانگریس کے لیڈروں سے مذاکرات کی بھی کوششیں کر رہے تھے اس سلسلے میں انہوں نے کانگریس کے تین رہنماؤں اور گاندھی سے مسلسل خط و کتابت جاری رکھی لیکن کانگریسی لیڈروں کی طرف سے انہیں ہمیشہ ٹکا سا جواب دیا گیا۔ کانگریس جو اقتدار کے نشے میں چور تھی، اپنی شرط کے سوا کسی اور بنیاد پر سمجھوتے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ کانگریس کی ہٹ دھرمی کی انتہا تو یہ تھی کہ لکھنؤ اجلاس کے بعد اگرچہ لیگ نے ضمنی انتخابات میں مسلم نشستوں پر زبردست

کامیابی حاصل کرلی تھی لیکن کانگریس اب بھی لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ اور ترجمان جماعت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ انگریزوں کے خلاف متحدہ اور مشترکہ جدوجہد کے لئے جناح نے کانگریس سے کسی معاہدے اور سمجھوتے پر پہنچنے کے لئے جتنی بھی کوششیں کیں کانگریس نے انہیں نہ صرف لیگ کی کمزوری قرار دے کر مسترد کر دیا بلکہ ان کا مذاق بھی اڑانے سے گریز نہیں کیا۔

سب سے بڑی خرابی اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ پنڈت جواہر لعل نہرو، ہندو مسلم مسئلے کے وجود ہی کے منکر نہ تھے بلکہ ان کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں سرے سے اقلیتوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بات یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ ان کا موقف یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں ایسی کوئی قابلِ ذکر مسلم تہذیب و تمدن اور ثقافت موجود نہیں جس کو محفوظ کرنے یا جس کے تحفظ کی ضرورت ہو۔ اس وقت کانگریس ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں برسراقتدار تھی۔ اس بنا پر وہ کچھ زیادہ ہی رعونت اور سخت گیری کے مظاہرے کر رہی تھی۔ اپنی اسی قوت اور بالادستی کے مظاہرے کے لئے وہ ہر اس کارروائی میں مصروف تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندوستان میں بے حقیقت اور غیر اہم ثابت کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے مسلم دشمنی پر مبنی کئی اقدامات کئے۔ مثلاً اس نے بندے ماترم کو قومی ترانے کی حیثیت دے دی۔ سرکاری اسکولوں میں ہندی کو اردو کی جگہ رائج کیا۔ گائے کے ذبیحہ کے خلاف قانون منظور کر کے اسے نافذ کر دیا گیا، ملازمتوں کے سلسلے میں امتیازی سلوک روا رکھ کر مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کیا گیا اور تعلیم کے سلسلے میں ودیا مندر اسکیم شروع کی گئی جس کی بنیاد ہندو عقائد پر تھی۔ کانگریس کے ان اقدامات کے ساتھ ہی ہندوستان کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ تصادم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صرف ایک برس کے عرصے میں ۱۵ سنگین اور خونریز

فسادات ہوئے جن میں ۱۳۰۰ افراد ہلاک اور ۵۰۰۰ زخمی ہوئے۔ ان فسادات کی شدت اور نوعیت سے لگتا تھا کہ ہندوستان خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے لیگ کے ایما پر اس عرصے میں تین تحقیقاتی رپورٹیں مرتب کی گئیں جن میں نہایت جامع شہادتوں اور ٹھوس ثبوتوں کی ساتھ بڑی تفصیل سے ان زیادتیوں کی نشاندہی کی گئی جو کانگریس راج کے دوران مسلمانوں پر روا رکھی گئیں چنانچہ انہی بنیادوں پر جناح نے اب کھل کر دوٹوک انداز میں کانگریس پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، آج ایک عام ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ اس سے بدتر سلوک کر رہا ہے۔ جناح نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ کانگریس ہی فسطائی انداز میں ہندو مسلم سمجھوتے اور مصالحت کے لئے کی جانے والی ہر مخلصانہ کوشش کو ناکام بنانے کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ جناح نے اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے مطالبہ کیا کہ اسلامیانِ ہند کی شکایات اور مصائب کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس کے بعد جب وائسرائے ہند نے، ہندوستان کی طرف سے دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں کے خلاف اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اعلان جنگ کیا اور کانگریس کی صوبائی وزارتیں اس اعلان کے خلاف بطور احتجاج مستعفی ہو گئیں تو جناح نے مسلمانوں کو اذن دیا کہ وہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس راج کے مظالم، تشدد اور ناانصافیوں کے خلاف "یوم نجات" منائیں۔ جناح کی اس اپیل پر اسلامیانِ ہند نے جس جوش و خروش اور والہانہ انداز میں لبیک کہا اس سے ہر کسی پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اسلامیانِ ہند بھی اس برِاعظم میں ایک مؤثر اور فعال قوت ہیں۔ ایسی قوت جس کو تسلیم نہ کرنا، چڑھتے سورج کی تکذیب کے سوا کچھ نہیں تھی۔ اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ کانگریس کا

یہ دعویٰ کہ وہ ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام کی واحد ترجمان ہے کتنا کھوکھلا اور بے حقیقت تھا۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء کے عرصے میں کانگریس نے مسلمانوں کو کچلنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ اتنے مذموم، غیر منصفانہ اور ظالمانہ تھے کہ مسلمانانِ ہند اور بالخصوص جناح سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس کل ہند وفاق میں، جس میں انہیں کانگریسی حکومت کے تحت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک اقلیت بن کر رہنا ہوگا۔ مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے، یہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ نہیں تھا جب وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی صوبے، مسلم اثر و نفوذ کیلئے مستحکم فصیل کا کام دیں گے اور مجوزہ وفاقی حکومت کے اختیارات اور اقتدار کو معقول حد تک رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوں گے لیکن اب آٹھ صوبوں میں دو سالہ کانگریسی راج کا تجربہ کرنے کے بعد ان کے یہ اندیشے درست ثابت ہو چکے تھے کہ کانگریس کا آخری مقصد ہندوستان میں بے رحم اکثریت کے بل بوتے پر ہندو راج قائم کرنے کے سوا کچھ نہیں اور اس بنا پر ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی امر مانع نہ تھا کہ صرف صوبائی خود مختاری ہی ان تمام مطلوبہ تحفظات کی ضامن نہیں بن سکتی تھی جو من حیث القوم ہندوستان میں ان کے وجود کے لئے ضروری تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر انہیں مجوزہ وفاق کے بارے میں اپنے موقف کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور ہونا پڑا اور انہوں نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں شامل وفاقی حصے کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ اگست ۱۹۳۹ء میں اس مطالبہ کو منظور کر لیا گیا۔

ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء کے عرصے پر محیط

کانگریس کا دو سالہ راج مسلمانوں کے لئے در پردہ ایک انعام ثابت ہوا۔ اس نے مسلمانوں کو بے حسی کے اس خواب غفلت سے بیدار کر دیا جس میں وہ کئی عشروں سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ چونکے، بیدار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے قومیت کے اس روحانی جذبے سے سرشار ہو گئے جو ان میں کافی عرصے سے موجود تھا۔ کانگریس کی جانب سے ان مسلسل کچوکوں اور مستقل ضربوں سے گھبرا کر اور پریشان ہو کر مسلمان نہ صرف چونکے بلکہ سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ امبید کر کا کہنا ہے کہ کانگریس کے اس سلوک کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے اجتماعی شعور سے کام لے کر اپنی قومی خواہشات، امنگوں اور تمناؤں کے واضح مربوط اور با مقصد تعین کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں ان کے احساس قومیت کی چنگاری، نیشنلزم کا بھڑکتا الاؤ بن گئی۔ اب وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے جذبے، عزم اور حوصلے سے سرشار تھے قدرت نے انہیں ایک ایسے علاقے سے بھی نوازا تھا جسے وہ اپنا وطن بنا کر ایک نوزائیدہ قوم کی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بھی بنا سکتے تھے۔ بقول ارنس رینن "ایک گروہ ایک قوم کی شکل اس وقت اختیار کر لیتا ہے جب اس میں احساس قومیت نیشنلزم کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے اور فطرت نے اس کے لئے کچھ ایسے علاقے مہیا کر دیئے ہوں جن کو وہ اپنا قومی وطن بنا سکتا ہو۔" یہ تھے وہ بنیادی عوامل جنہوں نے ہندوستان کے سیاق و سباق میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ اور منفرد قوم ہونے کے دعوے کا ذہنی اور عقلی جواز بھی فراہم کر دیا۔ چنانچہ جب ایک طویل وقفے کے بعد مسلمانوں کے لئے اپنی دلی خواہشات اور امنگوں کے اظہار کا موقع آیا تو انہوں نے علیحدہ مسلم قوم اور جداگانہ مسلم نیشنلزم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

بس یہی وہ مرحلہ ہے جب اسلامیان ہند نے بلا لاگ لپیٹ نہایت فخر سے ایک الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس ضمن میں قائداعظم نے نہایت واضح انداز میں

علیحدہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کی خصوصیات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

" ہم ایک قوم ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن، زبان و ادب اقدار و اخلاقیات، قوانین اور ضوابط، نام اور اصول اسلام ہماری رسوم اور تقویم، تاریخ اور رواج، رویے اور جذبات سب مختلف اور جدا ہیں۔ زندگی اور زندگی کرنے کے بارے میں ہمارا اپنا منفرد نقطہ نظر ہے۔ بین الاقوامی قوانین کے تمام معیاروں کے اعتبار سے ہم ایک قوم ہیں۔"

اسلامیان ہند پر ایک قوم ہونے کا یہ نیا انکشاف اور تازہ احساس ہندوستانی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرنے کا باعث بنا۔ وہ مسلمان جو اب تک ہندوستان میں ہندوؤں کی کثیر آبادی کے مقابلے میں خود کو ایک اقلیت سمجھتے تھے اور اسی حیثیت سے اپنے حقوق کے تحفظ کی ضمانتیں طلب کرتے تھے خواہ یہ ضمانتیں کاغذ کی حد تک ہی محدود کیوں نہ ہوں، اچانک ایک قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ایک ایسی قوم کی حیثیت، جو دوسروں سے قطعی منفرد اور علیحدہ تھی اور اسی بنا پر وہ اپنے لئے براعظم ہندوستان میں ایک جداگانہ اور خود مختار مملکت حاصل کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ قوم ہونے اور ہندوستان میں اپنے لئے ایک علیحدہ مسلم وطن بنانے کا مطالبہ بڑی قطعیت کے ساتھ اور ٹھوس شکل میں پیش کیا۔ تاہم اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک علیحدہ اور جداگانہ قوم ہونے کا احساس ہمیشہ سے موجود تھا۔ اپنے اس احساس کا اظہار انہوں نے گزشتہ صدی اور اس صدی میں مختلف انداز میں

کیا تھا۔ جداگانہ قوم ہونے کا یہی احساس تھا جس کی بنا پر انہوں نے مختلف انداز میں اور تسلسل کے ساتھ تحریکیں شروع کیں۔ تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر اس جداگانہ حیثیت کے اظہار میں انہوں نے کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ اگرچہ اس کے انداز مختلف تھے۔ مثال کے طور پر ۱۸۲۰ء سے ۱۸۶۰ء کے عشروں میں مجاہدین ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۰ء کے عشروں میں علیگڑھ اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء کے عشروں میں خلافت کی تحریکیں، پھر ۱۹۰۶ء میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ اور مسلم لیگ کا قیام، ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنو، ۱۹۲۹ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اور جناح کے چودہ نکات اور اب ۱۹۳۷ء میں جناح اور لیگ کی طرف سے کانگریسی وزارتوں میں شرکت کی بجائے کانگریس میں انضمام کی دعوت کو سختی اور حقارت سے مسترد کردینا یہ سب واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلمان ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے خود کو ہمیشہ ایک علیحدہ قوم سمجھتے تھے۔ اسی احساس کی بنا پر اکثر و بیشتر ان کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں تجاویز بھی پیش کی جاتی رہیں تاکہ اس خطۂ ارض میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن قائم ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے مولانا عبدالحلیم شرر نے اگست ۱۸۹۰ء میں تجویز پیش کی۔ اس آغاز کے بعد یہ تجویز مختلف اوقات میں مختلف الفاظ و بیان میں اظہار پاتی رہی تاآنکہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر لیگ کا سیشن منعقد ہوا۔ اس سیشن کی صدارت مفکر و شاعر اسلام علامہ اقبال نے کی اور وہ مشہور تقریر کی جو علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تقریر میں علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ اسلامیانِ ہند کی طرف سے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر واضح انداز میں تقسیم ہند کا تصور پیش کیا۔ علامہ اقبال کے اسی خطبۂ الہ آباد کی وجہ سے لیگ کے اس سیشن کو اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کے تین برس بعد ۱۹۳۳ء میں کیمبرج میں زیر تعلیم چوہدری

رحمت علی نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مجوزہ وطن کا نام یعنی پاکستان تجویز کیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہندوستان کی مسلم سیاست میں بالعموم پنجاب کے امور میں بالخصوص گہری دلچسپی کے سبب علامہ اقبال ۱۹۳۰ء کی دہائی میں جناح کے بہت قریب آگئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان وہ جناح سے مسلسل خط و کتابت میں مصروف رہے۔ جناح سے اس مراسلت میں علامہ اقبال نے برصغیر کی سیاسی صورتِ حال اور اس وقت کے اہم مسائل پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا ہے۔ انہوں نے ان خطوط میں اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ مسلم ہندوستان کے مختصر میعاد کے اور طویل میعاد کے مقاصد اور پروگرام کیا ہونے چاہئیں۔ ساتھ ہی وہ جناح سے یہ اصرار بھی کرتے رہے کہ لیگ کو ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کے لئے وہ اپنی انتھک جدوجہد جاری رکھیں۔ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر کے انہیں ایک ایسی منظم اور فعال قوت میں ڈھال دیں جسے ہر کوئی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ علاوہ ازیں اقبال اس بات پر بھی زور دے رہے تھے کہ مسلمانوں کے سینوں اور ذہنوں میں ایک علیحدہ مسلم قوم کے احساس کی بنا پر جو خواہشات، امنگیں اور جذبات ہمیشہ سے پرورش پاتے رہے ہیں جناح انہیں ایک قطعی شکل دے کر ایک مقصد سے ہمکنار کریں اور اسے قوتِ اظہار و بیان سے بہرہ ور کریں۔ اقبال کا جناح سے یہ اصرار بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلم تشخص کے فیصلہ کن اثبات اور ان کی غربت و پسماندگی دور کرنے کے لئے مطالبۂ پاکستان پیش کریں۔ خود جناح نے بعد میں ان خطوط کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جو اقبال نے برصغیر کی تاریخ کے اس اہم اور نازک دور میں انہیں لکھے تھے۔ علاوہ ازیں جناح اس بات کے بھی معترف تھے کہ ان خطوط میں اس عہد کے تمام اہم مسائل کی اس طرح واضح نشاندہی کی گئی تھی جس کی بنا پر انہیں ان مسائل کو نئے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور وہ بالآخر مطالبۂ

پاکستان کے حق میں ہو گئے۔

اقبال ایک دور بین اور مستقبل شناس آدمی تھے۔ وقت کی نبض کو پہچانتے اور مسلم قوم کے جذبات کو سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے خطبۂ الٰہ آباد میں نہ صرف تقسیم ہند کا وہ تصور پیش کیا جو بعد میں مطالبۂ پاکستان کی حیثیت سے سامنے آیا بلکہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک اپنی خط و کتابت میں جناح پر یہ زور بھی دیتے رہے تھے کہ انہیں اب کھل کر مطالبۂ پاکستان کا اعلان کر دینا چاہیئے اور اس مطالبے کو منوانے کے لئے تندہی سے کام کر کے نہرو کے نعرۂ آزادی اور روٹی کا توڑ کرنا چاہیئے ساتھ ہی مسلم عوام سے رابطے کی مہم چلانی چاہیئے۔ مگر جناح کیونکہ ایک عملی سیاست دان تھے اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد و منظم نہ کر لیا جائے مسلمانوں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان پیش کرنا نہ صرف قبل از وقت ہو گا بلکہ اپنی شکست کے مترادف بھی ہو گا۔

ان خطوط میں اقبال نے جو انداز، جو آہنگ اختیار کیا ہے اور جس طرح مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ اس امر کے غماز ہیں کہ انہیں جناح اور ان کی قیادت پر کس درجہ اعتماد اور یقین تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے جناح کو لکھا۔ "ہندوستان میں آج آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی طرف مسلمان، اس توقع کے ساتھ پُر امید لگا ہوں سے دیکھنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ انہیں بڑھتے ہوئے طوفان سے محفوظ و مامون طور پر نکال لے جائے گا۔" ایک اور موقع پر انہوں نے اس یقین و اُثق کا اظہار کیا۔ اس اہم اور سنگین مرحلے پر مجھے یہ یقین ہے کہ خدا نے آپ کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان سے کام لے کر آپ موجودہ مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔

اسلامیانِ ہند کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اپنی تاریخ کے اس اہم اور نازک موڑ پر مسلمانوں کے ان دو عظیم سپوتوں کے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی تھی جن میں

سے ایک فلسفی تھا اور دوسرا عملی انسان۔

اقبال کا یہی فکری اثر و نفوذ تھا جس کی بنا پر جناح اور لیگ دونوں بالآخر نہایت با اعتماد اور پُر زور انداز میں مطالبۂ پاکستان پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں مسلم مسئلہ کو فکری جہت عطا کی اور فکری طور پر اسے معنویت سے ہمکنار کیا۔ خطبۂ الہ آباد دراصل اپنے بطون میں مطالبۂ پاکستان کے فکری جواز کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے بڑے مؤثر انداز میں نشاندہی کی کہ ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نوعیت کا نہیں بلکہ اپنی اصل میں اس کی نوعیت بین الاقوامی ہے۔ ہندوستان کی یہ دو قومیں اپنے نظریۂ حیات اور عقائد کے ساتھ قطعی مختلف اور متضاد ہیں۔ اس لئے ان کا اتحاد یا انضمام ناممکنات میں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سیاسی اور ثقافتی پہلو ہی وہ بنیادی عوامل نہ تھے جنہوں نے قیام پاکستان کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی، اقتصادی، سماجی، لسانی اور مذہبی اختلافات وغیرہ تمام عوامل مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات پر اثر انداز ہوئے تھے اور ان میں اختلاف و امتیاز کا باعث تھے۔ یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے طور پر ایک جداگانہ اور آزادانہ وجود حاصل کرنے کے راستے پر گامزن کیا، اور پھر انہوں نے قیام پاکستان کی سمت اس تیور سے پیش قدمی کی کہ راہ میں پیش آنیوالی مشکلات کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ انہوں نے اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ اپنے لئے جو مملکت وہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں کوئی جغرافیائی تسلسل نہیں ہے۔ وہ اس بات سے بھی ہراساں نہ تھے کہ ہندو قوم جو عددی، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ برتر اور ترقی یافتہ ہے ان کی مخالفت پر آمادہ ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ہندوؤں نے اس مرحلے پر تاریخ، ثقافت اور روایات کی قوتوں کو بھی فراموش کر دیا، یا ہو سکتا ہے انہوں نے سوچا ہو کہ ان کے عظیم مفادات کا تقاضا یہی ہے کہ ان قوتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان پر ان کا ردعمل بہت تلخ اور مخاصمانہ تھا۔ اپنی مخالفت میں وہ اتنے شدید اور جذباتی تھے کہ وہ مسلمانوں میں من حیث القوم آنے والی تبدیلی کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں بھی ناکام رہے۔ انہوں نے مطالبۂ پاکستان کے عوامل کا تجزیہ کرنے کی بجائے اس مطالبہ پر جذباتی انداز میں نکتہ چینی کرتے ہوئے پاکستان پر ہر طرح سے طعن و تشنیع کو اپنا شعار بنا لیا۔ پاکستان کی مخالفت میں اپنا زورِ بیان صرف کرتے ہوئے وہ اس وقت ہندوستان کی صورت حال کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ مخالفت برائے مخالفت کے جذباتی دھارے میں وہ اس کھلی حقیقت کا بھی صحیح اندازہ لگانے سے قاصر رہے کہ مطالبۂ پاکستان پر مسلمانوں نے جس زبردست اور پرجوش انداز میں لبیک کہا ہے اس کی سیاسی اور نفسیاتی اہمیت کیا ہے۔ مخالفت کے اس طوفان میں وہ واقعی اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ مسلمان جو پہلے ہندوستان میں خود کو ایک اقلیت سمجھتے تھے اب سیاسی اور نفسیاتی اعتبار سے ان کے قلب کی ماہیت تبدیل ہو چکی ہے۔ ان کا جذبۂ قومیت اب نیشنلزم کے شعلۂ منیرت میں بدل چکا ہے۔ قومی شعور کی بیداری اب ایک جداگانہ قوم کے لئے الگ ملک کے دعوے اور اس دعوے کی تکمیل کے عزم صمیم میں ڈھل چکی ہے۔

دوسری طرف انگریز بھی اگرچہ مسلمانوں کے اس مطالبہ کے مخالف تھے لیکن ان کی مخالفت اتنی شدید نہ تھی۔ ان کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ان کی انا اور ان کے فخر پر شدید ضرب تھا۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ ہندوستان

اور ہندوستانی قوم کے اتحاد اور یکتائی کے معمار ہیں۔ اس اتحاد کو جو انہوں نے برطانیہ کی فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان اور یہاں آباد قوموں پر مسلّط کیا تھا، وہ اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ یہ اتحاد جدید ہندوستان کی تعمیر میں ان کا سب سے اہم اور دیرپا عنصر ثابت ہوگا جب کہ مطالبۂ پاکستان نہ صرف ان کے اس عظیم الشان دعوے کی نفی کرتا تھا بلکہ اس امر کی نشاندہی بھی کرتا تھا کہ وہ تاریخ کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ یہی اسباب تھے کہ وہ مسلمانوں کے اس مطالبے سے پریشان ہو گئے اور نفسیاتی طور پر انہوں نے فوراً ہی اس کی مخالفت بھی شروع کر دی۔

لاہور سیشن ۱۹۴۰ء اور اس میں قرار داد پاکستان کی منظوری ایک اعتبار سے قائداعظم کے اس مشن کی کامیاب تکمیل تھی جو انہوں نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ساتھ ہی اس سیشن اور اس قرار داد نے ان کے اس دعوے پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی کہ صرف وہی مسلم ہندوستان کی قیادت کے واحد علمبردار ہیں۔ ویسے حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں مسلم سیاست کو قیام پاکستان کی راہ پر لگانے اور مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی منزل پر پہنچانے میں قائداعظم سے زیادہ کسی اور نے فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا۔ امر واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے پاکستان کے اس دعوے کی جس پر زور طریقے سے انہوں نے وکالت کی، اور پھر خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر، مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان سے متعلق نہایت نازک، اہم اور پیچیدہ مذاکرات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں قائداعظم نے جو حکمتِ عملی اختیار کی، یہ اسی وکالت اور حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان ناگزیر ہو گیا۔

پاکستان کی جانب پیش رفت

۱۹۴۰ تا ۱۹۴۷

قائداعظم محمد علی جناح ؒ نے جو میدانِ سیاست کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ بساطِ سیاست پر کس وقت کون سا مہرہ آگے بڑھانا چاہیئے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مطالبۂ پاکستان پر مشتمل قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وائسرائے سے یہ یقین دہانی حاصل کی۔ (۸ اگست ۱۹۴۰ء) کہ ہز مجیسٹی کی حکومت " اپنی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کو منتقل کرنے کا ارادہ نہیں کر سکتی جس کے اختیارات کو ہندوستان کی قومی زندگی میں شامل کوئی بڑا عنصر قبول نہ کرتا ہو۔" اور یہ کہ برطانوی حکومت ان عناصر کی طرف سے کسی ایسی حکومت کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے جبر و استبداد اختیار کرنے میں فریق نہیں بن سکتی۔ وائسرائے کے اس اعلان کے بعد سے فی الحقیقت ہندوستان کے لئے تیار کئے جانے والے مستقبل کے کسی بھی آئینی انتظام کے سلسلے میں مسلمانوں کو ویٹو حاصل ہو گیا تھا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ مسلمان ایسی قوت بن گئے ہیں جس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ مقصد تھا جسے حاصل کرنے کے لئے جناح ۱۹۲۴ء سے مسلسل کوشاں رہے تھے۔ اسی طرح ستمبر ۱۹۳۹ء میں، جنگ چھڑنے کے بعد جب وائسرائے نے گاندھی کے ساتھ جناح کو بھی بات چیت کی دعوت دی تو درحقیقت یہ اس امر کی تصدیق تھی کہ

ہندوستان کے مسلمانوں میں جناح کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

اگست ۱۹۴۰ء کے اس اعلان کے بیس ماہ بعد کرپس تجاویز سامنے آئیں یہ تجاویز قیام پاکستان کی طویل اور کٹھن راہ پر اگلے قدم کی مترادف تھیں۔ فوری طور پر ان تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ جاپان کی یلغار کے مقابلے میں ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کیا جائے کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب جاپانی افواج برما پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے بعد آسام پر حملہ کرنے کے لئے تیار تھیں اور آسام بلاشبہ ہندوستان کا مشرقی دروازہ تھا۔ تاہم کرپس تجاویز کے طویل المیعادی مقاصد اس حقیقت میں مضمر تھے کہ ان تجاویز میں خود اختیاری کا اصول جو مطالبۂ پاکستان کی اساس تھا۔ صوبائی سطح پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس طرح کرپس تجاویز میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اس وقت مطالبۂ پاکستان ہی ہندوستانی سیاست کا اصل مرکزی مسئلہ ہے اس بنا پر کرپس تجاویز ایک طرح پاکستان کے برطانوی متبادل کے مصداق تھیں۔ کرپس تجاویز میں اگرچہ علاقائی بنیاد پر حق خود اختیاری کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا تاہم یہ بات چونکہ مسلمانوں کے اصل مطالبہ کی تکمیل نہ تھی، اس لئے لیگ نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ دوسری طرف کانگریس نے بھی یہ تجاویز مسترد کر دیں۔ تاہم اس کے فیصلے کا سبب بالکل مختلف تھا، یعنی یہ کہ ان تجاویز میں مسلم نقطۂ نظر کو بلاواسطہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد اور اس مرحلے پر جب کہ جاپانی افواج ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں، کانگریس نے اگست ۱۹۴۲ء میں اپنی وہ مہم شروع کر دی جس کا بڑا شہرہ تھا اور جس کی تیاریاں بڑے زور و شور سے کی جا رہی تھیں۔ یہ تھی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک۔ بلاشبہ یہ تحریک ہندوستان کی آزادی کے نام پر شروع کی گئی تھی لیکن فی الحقیقت اس کا مقصد اس

نازک اور سنگین دور میں انگریز حکومت پر دباؤ ڈال کر اس کو اس بات پر مجبور کرنا تھا کہ ہندوستان کی تمام دوسری پارٹیوں کو نظر انداز کر کے تمام اختیارات کانگریس کے حوالے کر دیئے جائیں۔ کانگریس کے یہ عزائم اس حقیقت سے بھی عیاں تھے کہ اس ضمن میں اس نے دوسری پارٹیوں سے مشورہ کرنے یا ان کا تعاون حاصل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جناح نے فوراً ہی کانگریس کے اس کھیل کو بھانپ لیا اور انہوں نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک سے الگ تھلگ رہیں۔ اس مرحلے پر کانگریس کی تمام تر توقعات کے برعکس، کانگریس کے الٹی میٹم کے سامنے جھکنے کی بجائے برطانوی حکومت نے احتیاطی اور انتظامی اقدامات کیے۔ کانگریس کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ کانگریس کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا، لاقانونیت، تشدد اور تخریب کاری سے نمٹنے کے لئے فوری اقدامات کئے گئے، کیونکہ اس موقع پر گاندھی نے "مارو اور مر جاؤ" اور "انگریزی راج کے خلاف کھلی بغاوت" کا جو پیغام دیا تھا اس کے نتیجے میں پورا ہندوستان ہنگاموں، فسادات اور توڑ پھوڑ کی لپیٹ میں آسکتا تھا۔ کانگریس کی یہ تحریک کچھ عرصے تو قدرے کامیابی سے چلی، لوگ اس سے متاثر بھی ہوئے۔ بھارتی پریس میں اس کی زبردست تشہیر بھی کی گئی، لیکن مرکزی قیادت کی عدم موجودگی میں یہ تحریک دیکھتے دیکھتے کچھ ہی عرصے میں پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔

مسلمانوں نے من حیث المجموع خود کو اس تحریک سے بالکل الگ تھلگ رکھا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلامیانِ ہند جناح پر کس حد تک اعتماد اور اعتبار کرتے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں پر ان کا کتنا زبردست اور گہرا اثر ہے۔ اس سے مسلم لیگ کے اس دعوے کی بھی تصدیق ہو گئی کہ صرف وہی ہندوستانی مسلمانوں کی واحد سیاسی ترجمان ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس وقت

تک ہونے والے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ ۵۶ مسلم نشستوں میں سے ۴۶ نشستوں پر کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ آئندہ تین سال میں مسلم لیگ کو مزید کامیابی اور تقویت حاصل ہوئی کیونکہ اس عرصہ میں کانگریس خود اپنی کرنی کے پھل کے طور پر سیاسی بن باس میں تھی اور جناح کو میدان صاف ملا۔ مثلاً نتیجتہً انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا کر نہ صرف لیگ کو مزید مستحکم اور منظم کیا بلکہ پاکستان کا پیغام ہندوستان کے دور دراز کونوں تک پہنچا دیا۔

دریں اثنا جناح نے ایک مؤثر مسلم پریس کی بنیاد ڈالنے کے لئے جو کوششیں کی تھیں وہ بھی اب بار آور ہو رہی تھیں۔ لیگ کے کئی روزنامے اور ہفت روزہ جریدوں کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے متعدد اخبارات بھی اب کھل کر مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے لگے تھے۔ لیگ کے تعاون سے مسلمانوں کی ایک خبر ایجنسی "اورینٹ پریس آف انڈیا" قائم ہو چکی تھی۔ اگرچہ یہ بہت محدود وسائل کے ساتھ اور محدود پیمانے پر قائم ہوئی تھی تاہم اس کے خوش گوار نتائج برآمد ہوئے۔ ابلاغ کے محاذ پر اس پیش قدمی کے ساتھ ہی مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی بڑے پیمانے پر تبلیغ و تشہیر ممکن ہو سکی کیونکہ اب تک ہندوستانی پریس جو کانگریس کے حلقۂ اثر میں تھا مسلم لیگ کے صحیح نقطۂ نظر سے لوگوں کو محروم رکھتا تھا، یا پھر وہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا تھا۔ یوں عام لوگ مسلم لیگ کے حقیقی موقف کی طرف سے اندھیرے میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود کہ مسلم پریس ان دنوں بے پناہ مشکلات سے دوچار تھا۔ اس نے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران خود کو مسلم رائے عامہ کے ترجمان کی حیثیت سے مستحکم کر لیا تھا۔ دوسری طرف مسلم پریس کے اس استحکام کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب اس کے توسط سے عامتہ المسلمین میں سیاسی بیداری کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں مسلم پریس مسلمانوں کے مؤقف اور نقطۂ نظر کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مطالبۂ

پاکستان کو بھی ایک نئی توانائی اور قوت دے رہا تھا۔ اس طرح مسلم پریس نے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے میں برطانیہ، کانگریس اور گاندھی سے ہونے والے نہایت جانکاہ اور اذیت ناک لیکن نہایت اہم مذاکرات کے دوران نہ صرف جناح کے ہاتھ مضبوط کئے بلکہ جناح اور لیگ کے لئے مسلم عوام کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کے لیے۔ مسلم پریس کے قیام کے ضمن میں جناح نے جو کوششیں کی تھیں۔ ان کا حاصل اور سب سے تابناک لمحہ وہ تھا جب اس ترقی پذیر مسلم پریس نے وہ قوت اور یکجہتی حاصل کر لی کہ مارچ ۱۹۴۷ء میں دہلی کے مقام پہ آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز کنونشن کا انعقاد ہوا۔ اس کنونشن میں دو نئے ادارے قائم ہوئے، یعنی آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز ایسوسی ایشن اور آل انڈیا مسلم ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن۔ ان اداروں کے قیام کے ساتھ ہی مستقبل میں قائم ہونے والی مملکت پاکستان میں، چوتھی ریاست کے قیام کے لئے بالآخر نہایت مستحکم بنیاد ڈال دی گئی۔

جناح ایک مکمل عملی سیاست دان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے مقاصد کیا ہیں اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع اور طریقے کیا ہونا چاہئیں۔ وہ حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے کی ایسی صلاحیتیں رکھتے تھے جو نہایت سربرآوردہ سیاست دانوں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر وہ شاید ہندوستان کے جملہ تمام لیڈروں میں واحد شخص تھے جنہوں نے، شاید انگریزوں سے بھی پہلے، جنہیں بالآخر اقتدار منتقل کرنا تھا، یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ قیامِ پاکستان اب ناگزیر ہو چکا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کا لمحہ آنے سے پہلے ہی جناح نے مستقبل میں قائم ہونے والی مملکت کے لئے مختلف اداروں کی تشکیل شروع کر دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے تجارتی اور صنعتی اداروں کے قیام کے سلسلے میں بھی مرکزی کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے کئی مسلم ایوانِ تجارت قائم کئے۔ کلکتہ میں وفاق مسلم

ایوان ہائے صنعت و تجارت قائم کیا۔ کلکتہ میں (۱۹۴۷ء) مسلم کمرشل بنک کی بنیاد رکھی۔ حبیب بنک کو اپنی سرپرستی سے نواز کر اسے ایک کُل ہند بنک کے درجے تک پہنچا دیا اور مسلمانوں کو بنکاری کی طرف راغب کیا۔ جہاں کلکتہ میں اورینٹ ایئرویز کی داغ بیل ڈالی۔ جو تقسیم سے قبل ہندوستان میں واحد مسلم ایئر لائن تھی۔ وہاں بمبئی میں محمدی اسٹیم شپ کمپنی قائم کی۔ یوں وہ نہ صرف مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور قیام پاکستان کی جنگ میں مصروف تھے بلکہ وہ مسلمانوں کو قدم بہ قدم ان تمام ذمہ داریوں کے لئے بھی تیار کر رہے تھے جو مستقبل میں ایک آزاد اور خود مختار ملک میں بسنے والی قوم کی حیثیت سے ان پر عائد ہونے والی تھیں۔

ان سب اداروں نے جہاں مسلمانوں کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا وہاں قائداعظم کی کل ہند پوزیشن کو بھی تقویت دی۔ حقیقتاً ۱۹۴۲ء کے کرپس اور "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی ناکامی کے بعد قائداعظم کی سیاسی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی اور اس کا اندازہ من جملہ اور واقعات کے سی۔ آر فارمولا کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ وسط ۱۹۴۳ء میں سی راجگوپال اچاریہ (۱۸۷۹ تا ۱۹۷۲) جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء کے دوران مدراس کے کانگریسی وزیر اعلیٰ تھے اور اپریل ۱۹۴۲ء سے پاکستان کی بنیاد پر کانگریس اور لیگ کے درمیان کسی نہ کسی سمجھوتے کے لئے کوشاں رہے تھے۔ جناح کو گاندھی کے ایما اور اجازت سے ایک فارمولا بھیجا تاکہ لیگ اس فارمولے کو منظور کر لے لیکن مسلم لیگ اس فارمولے کو منظور نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ بقول جناح، اس فارمولے میں ایک کھوکھلے کٹے پھٹے مسخ شدہ اور کرم خوردہ پاکستان کی پیش کش کی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایسی پیشگی شرائط بھی وابستہ تھیں جن کی بنا پر یہ فارمولا ناقابلِ عمل بھی بن گیا تھا۔

تاہم لیگ راجگوپال اچاریہ کے اس فارمولے کو، جو مسلمانانِ ہند کے مطالبۂ پاکستان کے سلسلے میں کانگریس کے متبادل کی حیثیت رکھتا تھا، ستمبر ۱۹۴۴ء میں جناح گاندھی مذاکرات کی بنیاد کے طور پر قبول کر لیا۔ یہ مذاکرات اٹھارہ دن جاری رہے لیکن ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا کیونکہ مہاتما اصل فارمولے سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ وہ سب کچھ لینے پر تو تیار تھے، کچھ دینے کے قائل نہ تھے۔ مہاتما کیونکہ ہندوستان کی پوری چالیس کروڑ آبادی کا واحد ترجمان بننے کے وہم میں مبتلا تھے اس لئے انہوں نے یہ بات بھی تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی ترجمان ہے۔ وہ یہ بات ماننے پر بھی آمادہ نہ تھے کہ مسلمانوں کو علیحدہ قوم کی حیثیت سے جینے کا حق ہے۔ اس کے برعکس وہ بھارت کے مسلمانوں کو ایسے ہندوستانی باشندوں سے زیادہ اہمیت دینے پر بھی تیار نہ تھے جنہوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔

درحقیقت ان مذاکرات کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ یہ مقصد بعد میں پیش آنے والے واقعات سے پوری طرح عیاں بھی ہو گیا۔ جناح سے مذاکرات پر آمادگی کا مقصد کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں تھا، بلکہ یہ تھا کہ وہ اس طرح وائسرائے سے بات چیت میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ تاثر قائم کر کے کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان مصالحت کا امکان ہے جس کے نتیجہ میں انگریز کے خلاف مشترکہ اور متحدہ جدوجہد کے آغاز کا ہوا کھڑا کر کے انہوں نے وائسرائے کو اپنے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

تاہم وقت اور حالات کے تجزیے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جناح گاندھی مذاکرات، قیامِ پاکستان کی سمت اسلامیانِ ہند کی پیش رفت میں ایک اور اہم قدم تھا جہاں کرپس کی پیش کش اس بات کی علامت تھی کہ انگریز مطالبہ پاکستان کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ وہیں ان مذاکرات سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی

کہ اس مطالبے کو نظر انداز کرنا اب کانگریس کے بھی بس میں نہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء تک یہ بات بھی طے ہو گئی تھی کہ انگریز اور ہندو خواہ تقسیم ہند کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں وہ اب پاکستان کے مسئلے کو پس پشت نہیں ڈال سکتے نہ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب یورپ میں جنگ کے خاتمہ کے بعد جون ۱۹۴۵ء میں برطانیہ نے مرکز میں ایک عبوری حکومت کی تشکیل کی تجویز پیش کی اس مقصد کے لئے جولائی میں ہونے والی شملہ کانفرنس اس بنا پر ناکامی سے دوچار ہوئی کیونکہ کانگریس اور وائسرائے ہند لارڈ ویول، دونوں میں سے کوئی بھی مرکز میں مسلم کوٹے کی تمام نشستوں پر ممبر نامزد کرنے کے سلسلے میں لیگ کا حق تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا جب کہ لیگ کا دعویٰ تھا کہ صرف وہی ایک ایسی پارٹی ہے جسے ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندگی کا استحقاق حاصل ہے۔ کانگریس ان مسلم نشستوں میں سے ایک پر اپنا مسلم "شو بوائے"، مقرر کرنے پر مصر تھی جب کہ وائسرائے مسلمانوں میں سے ایک برطانوی ایجنٹ مقرر کرنے کا خواہشمند تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں لیگ کا دعویٰ منظور نہ کیا گیا۔ تاہم اس بنیاد پر کہ جناح اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے، وائسرائے نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کرتے ہوئے کانفرنس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح گویا بباطن یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی کہ صرف جناح ہی وہ واحد شخص ہیں جو مسلمانوں کی طرف سے فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر مسلمانوں کے بارے میں کوئی فیصلہ ممکن نہیں۔ یوں وائسرائے کا یہ اعلان جناح کی ساکھ میں مزید اضافے کا سبب ہوا اور حتمی طور پر یہ بات طے ہو گئی کہ وہی مسلمانوں کے واحد قائد ہیں جو اسلامیانِ ہند کی ترجمانی کر سکتے ہیں ساتھ ہی اسلامیان ہند کا اپنے قائد اور اپنی جماعت پر اعتماد مزید مستحکم ہو گیا۔

شملہ کانفرنس چونکہ لیگ کی نمائندہ حیثیت کے مسئلے پر ناکام ہوئی تھی اس لئے جناح نے نہایت سختی سے مطالبہ کیا کہ پاکستان کے مسئلے اور لیگ کی حیثیت دونوں امور پر مسلمانوں کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے عام انتخابات کرائے جائیں اگرچہ کانگریس نے ابتداً اس مرحلے پر انتخابات کی مخالفت کی اور انتخابات کے التوا کے لئے مشرق میں جاپان سے ابھی تک جاری رہنے والی جنگ کا بہانہ پیش کیا، لیکن وائسرائے کے لئے لیگ کے اس مطالبے کو ٹالنا مشکل ہو گیا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اس وقت بحرالکاہل میں جاپان کے ساتھ برسرپیکار رہنے کے باوجود اپنے ہاں عام انتخابات کا انعقاد کر چکا تھا جس کے نتیجے میں لیبر پارٹی کامیاب ہوئی اور چرچل کی جگہ ایٹلی انگلستان کا وزیراعظم بن گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۵ء میں ہندوستان میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ ان انتخابات میں، جو اگلے موسم سرما میں ہونے والے تھے، اصل مقابلہ کانگریس اور لیگ کے درمیان تھا جب کہ بنیادی مسئلہ مطالبۂ پاکستان تھا۔ علاوہ ازیں یہ انتخابات قائداعظم کے اس دعوے کی بھی ایک کڑی آزمائش تھے کہ صرف انہیں مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ہے۔

اسلامیان ہند کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ مسلم لیگ اور قائداعظم اس کڑی آزمائش میں پورے اترے۔ انتخابات کے نتائج نے ان دعوؤں کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کر دی جہاں لیگ کے ہم پلہ کانگریس کے ہم پلّہ فریق کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی۔ وہاں ان انتخابات کے ذریعہ مسلمانوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی زبردست اور بھاری اکثریت مطالبۂ پاکستان کے حق میں ہے۔ اس طرح ان انتخابات کی بدولت ہندوستان تقسیم کے مرحلے کی سمت ایک اور قدم آگے بڑھ گیا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے نہ صرف مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے

لئے مخصوص تمام نشستوں پر کامیابی حاصل کی بلکہ تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نوّے فیصد نشستیں بھی جیت لیں۔ بہر حال بنگال کے سوا مسلم لیگ کو کسی صوبے میں اپنی اس زبردست کامیابی سے متمتع ہونے کا موقع نہ دیا گیا۔

بہر حال انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان فی الواقعی دو پارٹیوں میں بٹا ہوا ہے اور یہ کہ ہندوستان کی آبادی دو حصوں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں منقسم ہے اور ان قوموں نے اپنی تمام طاقت علی الترتیب کانگریس اور مسلم لیگ میں مرکوز اور منضبط کر دی ہے۔ ان انتخابی نتائج نے برطانوی حکومت کے حکمرانوں پر خوب اچھی طرح یہ بھی واضح کر دیا کہ اب دستوری سمجھوتے میں مزید تاخیر کرنا دراصل ملک کو مکمل انتشار اور بحران میں مبتلا کرنے کے مترادف ہو گا۔ دریں اثنا پورے ہندوستان میں آئی این اے کے مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی بحریہ میں مختصر مدت کے لئے اور محدود پیمانے پر بغاوت ہو گئی اور فضائیہ میں بھی ہڑتال ہوئی۔ ان واقعات سے ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت کے خول میں کیا کیا اور کیسے کیسے شگاف پڑ چکے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر پر مشتمل کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ اس مشن کا مقصد مختلف سیاسی جماعتوں کے صلاح مشورے سے ہندوستان کے لئے ایک آئین ساز ادارہ قائم کرنا اور ہندوستان میں ایک عارضی یا پاپولر حکومت کا قیام تھا۔ کانگریس اور لیگ میں کیونکہ کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان میں اب کسی بات پر اتحاد اور اتفاق بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے کیبنٹ مشن نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنے طور پر وہ تجاویز پیش کر دیں جو عام طور پر کیبنٹ مشن پلان کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان تجاویز کے تحت مرکز کو محدود اختیارات دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ یعنی مرکز کو صرف امور خارجہ، دفاع

اور مواصلات کی حد تک بالادستی حاصل تھی۔ علاوہ ازیں صوبوں کو تین خود مختار گروپوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بھی شامل تھی۔ ان میں سے دو گروپ، جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں واقع تھے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل تھے جب کہ تیسرا گروپ ہندو اکثریتی صوبوں پر مشتمل تھا۔

چونکہ جناح ایک عظیم مدبر تھے اور یہ ایک سنہری موقع تھا اس لئے اس سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے محدود مرکز اور صوبوں کی گروپ بندی سے متعلق شق کی تشریح کرتے ہوئے اسے پاکستان کی بنیاد قرار دیا اور لیگ کی کونسل سے اس پلان کو ۶ جون کو منظور کرالیا۔ لیگ کونسل کا یہ فیصلہ کانگریس کے لئے بڑا پریشان کن تھا۔ کیونکہ اس نے ابتداً اس پلان کا خیر مقدم اس بنیاد پر کیا تھا کہ یہ پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ہے اور اسے ساتھ ہی پاکستان کی موت قرار دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کانگریسی لیڈر اپنے ان خیالات اور نظریات کا پرچار اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔ کانگریس کا خیال تھا کہ اس پلان کے تحت اسے تمام اقتدار و اختیارات اپنی جھولی میں ڈالنے اور مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کرنے میں جناح کے سامنے جو اہم مصلحتیں تھیں اور جن کا انہوں نے بعد میں اظہار بھی کیا۔ وہ اس وقت کے حالات تھے۔ جناح نہیں چاہتے تھے کہ صورت حال بگڑ کر خون خرابے اور خانہ جنگی میں تبدیل ہو جائے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انتخابات میں ہندوستان کے مسلمان متفقہ طور پر فیصلہ دے چکے تھے اس امر کے باوجود کہ فریق مخالف مسلسل اشتعال انگیزیوں پر اترا ہوا تھا۔ اور اس کے باوجود کہ خود مشن پلان مرتب کرنے والوں نے اپنے ۱۶ مئی کے بیان میں بلا جواز اور بلا ضرورت طیش دلانے والے انداز میں پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جناح نے صرف اس بناء

پر کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ امن برقرار رہے، مشن پلان کو منظور کر کے ایک جرأت مندانہ اور دلیرانہ فیصلہ کیا تھا۔ حالانکہ یہ پلان اس مطالبے سے کہیں کم تھا جو وہ کرتے چلے آئے تھے۔ جناح کے اس فیصلے کو ہندوستان کے اندر اور بیرون ملک بھی زبردست طریقے سے سراہا گیا اور اسے ایک عظیم مدبرانہ فیصلہ قرار دیا گیا۔ جناح کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے آغا خان نے کہا ہے کہ "صرف اسی ایک فیصلے سے جو زیرکی، فراست، ہوشمندی، دانائی اور بے مثل سیاسی سوجھ بوجھ پر مبنی تھا جناح نے میرے اس دعوے کو سچ ثابت کر دکھایا کہ جن عظیم مدبروں سے میری ملاقات ہوئی جناح ان سب کے مقابلے میں انتہائی غیر معمولی تھے۔ اس فیصلے سے وہ عظمت اور بلندی کے اعتبار سے بسمارک کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔"

وائسرائے سے مختلف یقین دہانیوں کے حصول کے بعد لیگ عبوری حکومت میں شامل ہونے پر بھی رضامند ہو گئی لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر ہندو اور انگریزوں کی منافقت اور سیاسی جوڑ توڑ نے ایک نیا رنگ دکھایا۔ کانگریس نے کیبنٹ مشن سے خفیہ مذاکرات کئے جن کے نتیجہ میں وائسرائے لیگ سے کئے ہوئے تمام وعدوں اور یقین دہانیوں سے مکر گیا۔ ساتھ ہی اس نے وہ پیش کش بھی واپس لے لی جسے قبل ازیں عبوری حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں "حتمی" قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کو وائسرائے کی اس وعدہ خلافی سے سخت صدمہ پہنچا۔ دوسری طرف گاندھی سے لے کر تمام کانگریسی رہنماؤں نے، لیگ کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لئے صوبوں کی گروپ بندی کی تجویز کے خلاف تیز و تند اور تلخ مہم شروع کر دی۔ حالانکہ وہ یہی تجویز تھی جس کی بنا پر لیگ نے کیبنٹ مشن پلان منظور کیا تھا۔ اگست ۱۹۴۶ء میں کانگریس کا صدر منتخب ہونے پر نہرو نے تو حد ہی کر دی۔ انہوں نے سرے سے اس بات سے ہی انکار کر دیا کہ کانگریس نے مشن پلان کو منظور کر لیا تھا۔ انہوں نے

حقائق کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ کانگریس نے آئین ساز اسمبلی کے طریقہ انتخاب کے سوا کسی تجویز کو منظور نہیں کیا ہے اس ضمن میں افسوس ناک بات یہ تھی کہ کانگریس کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر کے لیگ نے اپنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر افسوس ناک اور تشویشناک بات یہ تھی کہ اب جب کہ یہ بات یقینی تھی کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر واپس جانے والے ہیں، کانگریس نے
۱۰ ابھی سے ایسا تاثر دینا شروع کر دیا تھا (بقول لیمبے) جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالآخر لیگ کو اپنی مرضی کا تابع بنا کر رہے گی اور منصوبے کی تشریح اپنے طور پر کرے گی۔ ان حالات میں جناح کو، جو لیگ سے اس منصوبے کو منظور کرانے کے اصل ذمہ دار اور محرک تھے، شدت سے احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکا اور فریب کیا گیا ہے اور ان کی سخت توہین کی گئی ہے۔ جناح کو سب سے زیادہ تکلیف برطانیہ کے رویے سے پہنچی تھی، جس نے کانگریس کی اس قلابازی اور منصوبے کی غلط تشریح اور تعبیر پر نہ صرف خاموشی روا رکھی اور چشم پوشی سے کام لیا بلکہ عبوری حکومت کے مسئلے پر لیگ کو بھی اپنی مکاری، فریب اور دغا کا نشانہ بنایا۔ انگریزوں نے لیگ کے ساتھ یہ سلوک صرف کانگریس کے ایما پر اختیار کیا اور یہ اس عریاں حقیقت کے باوجود کیا کہ یہی وہ کانگریس تھی جس نے اس منصوبے کو کلیتہً اور حفظ ماتقدم کے بغیر قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ ایسی صورت حال میں قائداعظم اور لیگ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ قطعی طور پر یہ اعلان کر دیں کہ لیگ نے اس سے قبل منصوبے کی جو منظوری دی تھی اندریں حالات اسے واپس لیا جاتا ہے لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا اور ایک مرتبہ پھر لیگ نے اپنے پرانے مطالبات کا دوٹوک انداز میں پوری شدت اور قوت کے ساتھ اعادہ کرتے ہوئے مشن پلان کے تحت تشکیل دیئے جانے والے آئینی انتظام سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا اعلان کر دیا اور یہ فیصلہ

کیا کہ ضرورت پڑنے پر راست اقدام یعنی ڈائریکٹ ایکشن کی راہ بھی اختیار کی جائے گی۔ راست اقدام کے بارے میں مسلم لیگ کا یہ فیصلہ نہ صرف پاکستان حاصل کرنے کے لئے تھا بلکہ کانگریس کی اُس دھمکی کے جواب میں بھی تھا جو اس نے برطانوی حکومت کو دی تھی اور کہا تھا کہ اگر اس نے کانگریس کے نقطۂ نظر کو کلی طور پر منظور نہ کیا تو وہ برطانوی حکومت کے خلاف راست اقدام شروع کر دے گی۔

ویسے حقیقت یہی ہے کہ حالات کی اس کروٹ سے جو نئی صورت حال پیدا ہوئی تھی اس میں مسلم لیگ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ کھل کر مقابلے پر آ جائے۔ فریقِ مخالف کے مکر و فریب کا اولوالعزمی کے ساتھ جواب دینے کے لئے سینہ تان کر ڈٹ جائے۔ یہ مسلم لیگ کا نیا روپ تھا۔ اس کا مظاہرہ اُن تین اہم فیصلوں میں ہوا جو لیگ نے ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو کئے۔ اوّلاً، اس نے مشن پلان کی منظوری واپس لے لی۔ ثانیاً اس نے حصول پاکستان اور برطانیہ کی موجودہ غلامی اور مستقبل میں ہندو تسلط کے تحت اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس میں اسے جکڑنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ راست اقدام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ثالثاً اس نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ برطانیہ نے جس طرح مسلمانوں کے ساتھ دغا اور مکر و فریب سے کام لیا ہے اس کے خلاف بطور احتجاج وہ تمام برطانوی خطابات واپس کر دیں۔ اس طرح مسلم لیگ نے اپنی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ آئینی جدوجہد کو خیر باد کہہ دیا۔ اس نے اب راست اقدام کا فیصلہ کر لیا اور جنگ کی راہ اختیار کر لی۔

قائداعظم ایک زیرک سیاست دان تھے، اس لئے وہ ان نتائج کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے جو تقسیم بنگال (۱۹۱۱ تا ۱۹۱۵ء) کے بعد اختیار کئے جانے والے احتجاجی اقدامات، مظاہروں اور جلسے جلوسوں کی بنا پر مرتب ہو سکتے تھے۔

وہ اس رویے سے بھی خوب واقف تھے جو برطانوی حکومت ہندوستان کے سلسلے میں اختیار کرتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ برطانوی حکومت جہاں میانہ رو رہنماؤں کے بعض آئینی مطالبات کو کسی حد تک مان لیتی تھی، وہیں وہ اکثر و بیشتر سڑکوں پر ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور راست اقدام جیسے طریقوں کے سامنے گھٹنے بھی ٹیک دیتی تھی۔ لہٰذا اگر جدوجہد پاکستان کے اس مرحلے پر قائداعظم راست اقدام جیسی کارروائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرتے تو یہ ان میں سیاسی حقیقت پسندی اور سوجھ بوجھ کی کمی کا ثبوت ہوتا۔ چنانچہ حالات کے تقاضوں کے مطابق، جناح جیسے آئین پسند شخص نے ۱۹۴۶ء کے اس زبردست اور سنگین بحرانی دور میں راست اقدام جیسی کارروائی کی دھمکی دی۔ تاہم انہوں نے یہ دھمکی اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ راست اقدام کو آئینی جدوجہد کا متبادل سمجھنے لگے تھے بلکہ اس لئے کہ اس دھمکی سے آئینی جدوجہد کو تقویت پہنچائی جائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کو راست اقدام شروع کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کام صرف دھمکی سے ہی چل گیا۔ کانگریس اور برطانوی حکومت اپنے رویے اور موقف میں کچھ لچک پیدا کرنے پر مجبور ہو گئی۔

دریں اثنا کانگریس اور وائسرائے کے درمیان ہونے والے خفیہ مذاکرات کے نتیجہ میں ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت نہرو کی زیر قیادت ایک عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس حکومت میں کیونکہ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے "یوم سیاہ" منایا اُس دن ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے "ہندو حکومت" کے قیام کا مذاق اڑانے اور اس پر احتجاج کرنے کے لئے اپنے گھروں، تجارتی ایوانوں اور مختلف مسلم اداروں پر سیاہ پرچم لہرائے۔

ادھر کانگریسی حکومت کے قیام سے دو ہفتہ قبل ہی کلکتہ میں بہت بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ یہ فسادات اتنے وسیع و عریض پیمانے

پڑھتے جس کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی۔ صرف تین دن کے اندر پانچ ہزار افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے جب کہ زخمی ہونے والوں کی تعداد اس سے دگنی تھی۔ یہ فسادات کلکتہ تک ہی محدود نہ رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کی آگ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ بمبئی، احمد آباد، نواکھالی، بہار، گڑھ مکیشنر اور دیگر شہر ان فسادات کی لپیٹ میں آگئے۔ بہار اور گڑھ مکیٹشر میں تو یہ فسادات یک طرفہ معاملہ تھے ہندوؤں کے قاتل جتھوں نے نہایت بے رحمی اور شقی القلبی کے ساتھ ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا اور بہار میں تو یہ تعداد کہیں زیادہ تھی۔

قائد اعظم کو اس صورت حال پر نہایت تشویش اور پریشانی تھی۔ چنانچہ وائسرائے سے ان کی گفت و شنید مزید وائسرائے کی نئی پیش کش کی بنا پر لیگ ۲۵ ، اکتوبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں شامل ہو گئی۔ عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ قائد اعظم کے ایما پر مسلم لیگ نے تین وجوہ کی بنا پر کیا تھا۔ اوّلاً وہ مرکزی حکومت کی پوری انتظامیہ کو کانگریس کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ دوم' وہ حکومت کے اندر اور باہر رہتے ہوئے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی تھی اور سوم' راست اقدام کے پروگرام کے تحت وہ سرکاری سطح پر بھی کانگریس سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ تاہم عبوری حکومت میں شامل ہونے کے باوجود لیگ اپنے اس موقف پر سختی سے قائم رہی کہ وہ آئین ساز اسمبلی میں نہیں جائے گی، نہ آئین سازی کی اس مشینری میں حصہ لے گی جو کیبنٹ مشن نے اس وقت تک کے لئے فراہم کی تھی جب تک کانگریس کیبنٹ مشن کی تجاویز کو کلی اور غیر مشروط طور پر قبول نہ کرلے۔ دسمبر میں تین پارٹیوں (کانگریس، لیگ اور اکالی دل جو سکھوں کی نمائندہ جماعت تھی) کی ایک کانفرنس نہایت عجلت میں لندن میں بلائی گئی۔ یہ کانفرنس بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تاہم تاریخی اعتبار سے یہ کانفرنس قیام پاکستان کی سمت پیش قدمی میں اٹھنے والا ایک اور قدم ثابت ہوئی۔ اس کے

نتیجے میں کیبنٹ مشن پلان میں تجویز کئے گئے صوبوں کی گروپ بندی کے بارے میں لیگ کے موقف کو تقویت پہنچی۔ ساتھ ہی لیگ کو کانگریس کا کردار بے نقاب کرنے اور کھل کر ہر کسی پر یہ واضح کر دینے کا موقع بھی ملا کہ اس مشن پلان کو بروئے کار لانا صرف کانگریس کا حق نہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے اپنے ۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کے بیان میں قطعی طور پر یہ ضمانت دی کہ ہز میجسٹی کی حکومت اس آئین کو جو ایسی آئین ساز اسمبلی نے تیار کیا ہو جس میں ہندوستانی آبادی کے ایک بڑے حصے کی نمائندگی نہ ہو۔ ملک کے ان علاقوں پر مسلّط نہیں کر سکتی جو اسے قبول نہ کرتے ہوں۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، کانگریسی لیڈروں اور پریس نے ابتداً کیبنٹ مشن پلان کا یہ کہتے ہوئے خیر مقدم کیا تھا کہ یہ پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ہے لیکن اس کو خود کانگریس نے اپنے ہاتھوں سے جس بیدردی سے مسخ کیا تھا معلوم ہوتا تھا وہ متحدہ ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا لیکن کانگریس، اقتدار کے نشے میں چور اب بھی اپنی بے رحم اکثریت کے بل بوتے پر لیگ کو قطعی نظر انداز کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ چنانچہ طے شدہ تاریخ یعنی ۹ دسمبر کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتے ہی کانگریس سنگین اور تباہ کن نتائج کی پرواہ کئے بغیر، نہرو کے دیئے ہوئے خطوط پر آئین سازی کے کام میں منہمک ہو گئی۔ دوسری طرف لیگ نے اس اسمبلی کا بائیکاٹ جاری رکھا۔

۱۹۴۶ء کے خاتمہ پر خونریز فرقہ وارانہ فسادات نے پورے ہندوستان کو مزید شدت کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس مرتبہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لئے لڑائی شروع کی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت اور بھی دھماکہ خیز ہو گئی جب مسلم لیگ نے پنجاب، سرحد اور آسام میں سول

نافرمانی کی تحریکیں شروع کیں۔ ان تحریکوں کا مقصد پنجاب اور سرحد کی حد تک شہری آزادیوں کی بحالی تھا جب کہ آسام میں اس کا مقصد اس لائن سسٹم کا خاتمہ تھا جو وہاں جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کی طرز پر مسلمانوں کے خلاف اختیار کیا گیا تھا۔ اندریں حالات معلوم ہو رہا تھا جیسے اقتدار کی پُرامن منتقلی کا وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کی سنگینی میں ایک اور وجہ سے بھی اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ عبوری حکومت، مخلوط یا قومی حکومت کی حیثیت سے کام کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ چنانچہ کانگریس نے وائسرائے کو یہ الٹی میٹم دے دیا کہ عبوری حکومت سے لیگ کے نمائندوں کو نکال دیا جائے۔ کانگریس کے اس الٹی میٹم سے آخر کار اب برطانوی حکومت پر بھی یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی تھی کہ ان کے لئے نہ صرف کانگریس کو کیبنٹ پلان کی اس تشریح پر راضی کرنا ناممکن تھا جو لیگ کر رہی تھی اور ساتھ ہی ان کے لئے لیگ کو اس وقت تک اسمبلی میں شرکت پر بھی آمادہ کرنا ممکن نہ تھا جب تک کہ کانگریس غیر مشروط طور پر کیبنٹ مشن پلان تسلیم نہ کر لے۔ علاوہ ازیں خود انگریز بھی اب اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ ہندوستان پر اپنی طرف سے کوئی فیصلہ مسلّط کر دیتے۔ چنانچہ ہندوستان سے برطانیہ کی واپسی کے لئے ایک وقت کا تعین کر دیا گیا۔ لارڈ ویول کو اس بنا پر ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا کہ بعض مطالبات پورے نہ کرنے کی وجہ سے وہ کانگریس کا اعتماد کھو چکا تھا۔ لارڈ ویول کی جگہ وائی کاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا اور اسے انتقال اقتدار کی تفصیلات طے کرنے کے فرائض سونپے گئے۔

ماؤنٹ بیٹن، بادشاہِ انگلستان کا قریبی عزیز تھا اور انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں اپنے طور پر تمام تفصیلات طے کرنے کے مکمل اختیارات کے ساتھ ہندوستان

بھیجا گیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچنے کے بعد ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو حلف اٹھایا اور پھر فوراً ہی مختلف ہندوستانی لیڈروں سے طویل مذاکرات میں مصروف ہو گیا۔ جناح کے لئے وائسرائے سے ہونے والے یہ طویل مذاکرات، جو چار ماہ تک جاری رہے، ان مذاکرات سے زیادہ جانکاہ، تکلیف دہ اور مشکل ثابت ہوئے جو انہوں نے پچھلے موسم گرما میں کیبنٹ مشن سے کئے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں برطانوی عہد کے دوران، برطانوی حکومت نے جتنے بھی سیاست دانوں یا نمائندوں سے مذاکرات کئے تھے، یہ مذاکرات ان سب سے زیادہ پیچیدہ، زیادہ نازک اور زیادہ اہم تھے اور یہ مذاکرات تاریخ کے ایک سنگین اور فیصلہ کن دور میں جناح کو کرنا پڑے۔ اگرچہ اس وقت یہ بات کسی کے سامنے نہ آسکی لیکن بعد میں جو یادداشتیں اور دستاویزات شائع ہو کر اب تک سامنے آئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح نے کن مشکلات میں یہ مذاکرات انجام کو پہنچائے ہوں گے کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذاتِ خود قیام پاکستان کا بدترین مخالف تھا اور اس مطالبہ کو کسی قیمت پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور وہ ایک آہنی دیوار بن کر قیام پاکستان کی راہ میں حائل تھا۔

۳ جون کے پلان کے ذریعہ جو عرفِ عام میں ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے مشہور ہے پاکستان حاصل کرنا، اور بالخصوص ان عوامل اور قوتوں سے مناظرے اور مقابلے کے بعد حاصل کرنا، جو اس وقت مسلمانوں کے مطالبے کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ بلاشبہ جناح کی ایک بہت بڑی اور عظیم الشان کامیابی تھی۔ ان تمام مخالفتوں اور مشکلات کو جناح نے کس طرح سر کیا ہو گا اس کا اندازہ مختصراً چند باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ اولاً تو یہ کہ ویول کی سبکدوشی اور ماؤنٹ بیٹن کی تقرری گاندھی اور نہرو کے اصرار و ایما پر ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے تمام وزن کانگریس کے پلڑے

میں ڈال دیا تھا۔ دوم یہ کہ اس وقت برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار تھی جو ہمیشہ سے ہندوؤں کی طرف دار تھی جب کہ اس مرحلے پر وہ نہرو کی کھل کر حمایت کر رہی تھی۔ سوم بات یہ بھی کہ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کے مردے میں جان ڈال کر متحدہ ہندوستان کو اختیارات منتقل کرے یعنی اس کی کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ تقسیم ہند نہ ہو سکے۔ چہارم بات یہ کہ ماؤنٹ بیٹن خود بھی کانگریس کا طرف دار تھا۔ اس کے نہرو سے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ دوستانہ روابط اس وقت قائم ہوئے تھے جب نہرو نے مارچ ۱۹۴۶ء میں سنگاپور کا دورہ کیا تھا۔ پنجم یہ کہ ماؤنٹ بیٹن خود بھی متحدہ ہندوستان کا حامی تھا۔ وہ پاکستان کو محض ایک "پاگل پن" اور بہت بڑی برائی قرار دیتا تھا اور اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اپنے پیچھے دفاع کے عام امور سے متعلق کسی نہ کسی قسم کی ایک مرکزی حکومت ضرور چھوڑ جائے۔ تقسیم ہند کے تقریباً ۲۵ برس بعد اس نے خود، کولنس اور لاپیئر سے کہا تھا کہ "اس وقت ہم میں سے کوئی بھی اور بالخصوص میں تقسیم ہند نہیں چاہتا تھا" حقیقت یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس اور اس کے رہنماؤں بالخصوص گاندھی، نہرو اور پٹیل کے لئے اپنی پسندیدگی کو چھپانے میں بھی عار محسوس نہ کیا۔ وہ کھل کر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتا اور دوسری طرف کھل کر جناح پر عدم اعتماد کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔ اپنی اس پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں وہ اتنا انتہا پسند تھا کہ اس کا کھلے بندوں اظہار اس نے اس دور میں بھی جاری رکھا جب انتقالِ اقتدار سے متعلق یہ نازک مذاکرات جاری تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان مذاکرات کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ وی پی مینن سے بھی بے حد متاثر ہو گیا جو اس وقت ریفارمز کمشنر تھا اور جس کی تمام تر ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں جس کی تصدیق وائسرائے کے پرسنل سیکرٹری ماٹیول نے بھی کی ہے۔

اس طرح یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، انتقال اقتدار کے مسئلے کو منصفانہ طریقے سے حل کرنے کے لئے غیر جانبدارانہ انداز فکر کے ساتھ ہندوستان نہیں آیا تھا بلکہ یہ تہیہ کر کے انگلستان سے چلا تھا کہ ہر قیمت پر وہ برطانوی حکومت کی خواہشات کو ان تمام اختیارات کے ساتھ انجام دے گا جن سے اسے لیس کیا گیا تھا جن کا مقصد ہندوستان کو تقسیم ہونے سے بچانا تھا۔ وہ یہ فرض ادا کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس حقیقت کو بھی فراموش کر چکا تھا کہ متحدہ ہندوستان کا معاملہ بالواسطہ طور پر برطانوی حکومت کے ۶ دسمبر ۱۹۴۶ء اور ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کے بیانات کے ذریعے پہلے ہی طے ہو چکا تھا اور یہ کہ برطانوی حکومت نے یہ بیانات بخوشی نہیں بلکہ لیگ کی طرف سے آئین ساز اسمبلی کے مسلسل بائیکاٹ سے مجبور ہو کر جاری کئے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن پیپرز اور اس دور کی دیگر دستاویزات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت کلی طور پر عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم سے بچانے کے لئے ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان کتنا قریبی رابطہ اور تعاون تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ان مذاکرات میں اسے جناح سے شکست اٹھانی پڑی تو اس نے جھلا کر انتقامی جذبے سے کام لیتے ہوئے یہ طے کر لیا کہ اگر حالات سے مجبور ہو کر اسے تقسیم ہند پر مجبور ہونا پڑا تو پھر وہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی راہ اختیار کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے نتیجہ میں ان صوبوں کے مسلمانوں پر سے جناح کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ پاکستان کو ایک ناقابلِ عمل اور لنگڑا لولا ملک بنانے پر تل گیا۔ غرض یہ کہ جناح ایسی مخالف اور دشمن حکومت سے انتقال اقتدار کے نازک مسئلے پر مذاکرات کرنے پر مجبور تھے۔ یہ حکومت اور اس کا ہر نمائندہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کا حریف تھا اور مخالف فریق یعنی کانگریس کا حلیف تھا۔ تاہم ان بے پناہ مشکلات کے باوجود ان مذاکرات کے سلسلے میں یہ ان کی خداداد

صلاحیتوں کا کمال تھا اور سیاسی سودے بازی میں ان کی مہارت تھی کہ انہوں نے وائسرائے اور کانگریس کے لیڈروں کو سوچون کے پلان میں قیام پاکستان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کر ہی دیا۔

مذاکرات میں جناح کی اس کامیابی میں، ان کی آزادئ فکر، حق گوئی، بے باکی، دیانت، خلوص، آہنی عزم، مقصد سے گہرے لگاؤ، باطل کو قبول نہ کرنے اور حق سے دستبردار نہ ہونے کی صفات عالیہ کا بھی بڑا دخل تھا۔ ماؤنٹ بیٹن پیپرز اور اس عہد کی دیگر دستاویزات بھی جناح کی ان صفات کا بیّن ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہی اوصاف کی بدولت تنہا جناح نے ماؤنٹ بیٹن جیسے ہٹ دھرم اور اڑیل شخص کا جب کہ اسے نہ صرف برطانیہ کی پشت پناہی حاصل تھی نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ اس میں کامیاب بھی رہے اور یہ بھی ایک نہایت ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص ماؤنٹ بیٹن کی چال بازیوں اور اس کے مکر و ریا کے پُرفریب جال کے تار و پود بکھیر سکتا تھا تو وہ صرف جناح ہی کی ذات تھی۔ ماؤنٹ بیٹن وہ آدمی تھا جو نہرو سمیت کانگریس کے تمام لیڈروں سے جو بات چاہتا منوا سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ وہ انہیں تقسیم ہند پر بھی باآسانی راضی کر سکتا تھا لیکن جناح، ماونٹ بیٹن کے لئے ایک ناقابل تسخیر چٹان ثابت ہوئے۔ خود ماؤنٹ بیٹن نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے "مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھ میں لوگوں سے اپنی بات منوانے کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں"۔ لیکن جناح نے اس کی ان صلاحیتوں کو نیچا دکھا کر اس کا غرور توڑ دیا۔ چنانچہ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کے مصنفین سے ماؤنٹ بیٹن نے ایک مرتبہ پھر اعتراف کیا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے لیکن جناح کے مقابلے میں اسے شکست ہوئی۔

اسلامیانِ ہند کے لئے جناح نے انفرادی طور پر جو انتھک جدوجہد کی تھی اور

بالآخر ان کے لئے شدید رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود جس طرح ایک آزاد مملکت حاصل کی تھی اس کے عقیدت مندانہ اعتراف کے طور پر مسلم لیگ نے جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا حالانکہ اس معاملے میں بھی ماؤنٹ بیٹن مسلسل بلیک میل سے کام لے رہا تھا۔ وہ لیگ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا لیکن لیگ اس سے مرعوب نہ ہوئی اور اس نے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد نہ کیا۔ البتہ کانگریس نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کو بھارت کا پہلا گورنر جنرل نامزد کر دیا۔ تاہم لیگ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔

مسلمانوں کے نقطہ نظر سے جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کی سفارش کو سمجھنے کے لئے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں جناح اپنی زندگی کے ایک انتہائی منفرد اور اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ مسلم عوام کے ساتھ ان کے رشتے اتنی گہرائیوں اور استحکام کے ساتھ قائم ہو چکے تھے کہ شاید یہ کبھی کسی عوامی رہنما اور عوام کے درمیان قائم نہ ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں جناح اور عام آدمی؛ در تحریک پاکستان کے درمیان جس کے وہ قائد تھے فی الحقیقت مکمل یکتائی اور یک جہتی قائم ہو چکی تھی۔ یوں ۴۸۔۱۹۴۷ء کے دوران وہ ایک عظیم مدبر اور رہبر اور ایک آزاد مملکت کے بانی تھے۔ یہ تمام عظمتیں صرف ایک شخص کی ذات میں مجتمع ہو چکی تھیں۔

قومی تاریخ کے اس نصف النہار میں اپنے اسی کردار کی بدولت قوم کے رہنما تھے ان کی وابستگی اتنی گہری ہو چکی تھی کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے قیام پاکستان کے لئے کردار ادا کیا۔ یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ اس دوران میں جناح اور ان کے عوام کے درمیان وہی یک جہتی پیدا ہو چکی تھی جو برطانیہ کی لڑائی کے دوران ۱۹۴۰ء میں چرچل نے فرانس پر جرمن قبضے کے دوران (۴۴۔۱۹۴۰)

چارلس ڈیگال نے، اور دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی میں کانراڈ ایڈناور نے اپنے عوام سے قائم کی تھی۔ جب کسی قوم کی زندگی کے نازک اور اہم دور میں کسی رہنما کی ذات، قوم کی حکمت عملی، اس کے انداز فکر پر اتنے گہرے طریقے سے اثر انداز ہونے لگے کہ وہ قوم کے مزاج اور اس کی امنگوں اور خوابوں کا مرکز بن جائے تو ایسے لیڈر کو عام طور پر کسی ملک یا قوم کی تجسیم کہا جاتا ہے۔ عوامی فکر اور رہنما کے درمیان ایسی ہی یک جہتی بعض اوقات "ایڈناور کا جرمنی" جیسی بامعنی اصطلاحات وضع کرنے کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے ۱۹۴۰ء کی دھائی میں "جناح کا پاکستان"، جیسی اصطلاح کا وضع ہونا بھی دراصل اس امر کی نشاندہی ہے کہ ان کی ذات میں ان کے عوام کی امنگوں اور خواہشوں کی تجسیم ہو گئی تھی اور یہ حقیقت بعد میں اس امر سے بھی واضح ہو گئی کہ وہ نہ صرف پاکستان کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سبب تھے بلکہ وہ اس نوزائیدہ مملکت کی بقا اور نشوونما کے امکانات کو بھی روشن اور واضح کرنے کا سبب بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری عشرے میں جناح، نہ صرف ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران اسلامیان ہند کی پیش رفت اور فروغ کا نمائندہ بن کر ابھرے بلکہ وہ ہندوستان کے جسدِ سیاست میں در آنے والی نئی اور پیچیدہ قوتوں کے پیش کردہ چیلنج کے مقابلے میں کامیابی کی علامت اور ضمانت بھی بن کر سامنے آئے۔

چنانچہ جب گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح کے تقرر کا اعلان ہوا تو مسلمان حلقوں میں بے پایاں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیاقت علی خان نے اس تقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی قیادت میں ہم نے آزادی کی جدوجہد کی ہے یہ اس کا قدرتی حاصل ہے۔" سردار عبدالرب نشتر نے جو صف اوّل کے لیگی رہنماؤں میں سے ایک تھے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جناح اس مملکت کے

معمار ہیں۔ اس کے امور کی نگرانی کے لئے ان سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں ہو سکتا۔"

بہر حال ماؤنٹ بیٹن پلان کے طے شدہ پروگرام کے تحت برطانوی حکومت کی جانب سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو اقتدار منتقل کر دیا اور شاہ انگلستان کا جو اس وقت تک شہنشاہ ہندوستان بھی تھا پیغام پڑھ کر سنایا۔ قائد اعظم نے جن کو تین دن قبل پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے اپنا صدر مقرر کیا تھا ماؤنٹ بیٹن کی تقریر اور شاہ انگلستان کے پیغام کا جواب دیا۔ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کی آزادی کا نشان یعنی پرچم ستارہ و ہلال اسی دن قانون ساز اسمبلی کی عمارت پر لہرایا گیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۵ اگست کو قائد اعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا جس کے بعد پاکستان کی پہلی کابینہ نے بھی نواب زادہ لیاقت علی خان کی سربراہی میں حلف اٹھایا۔

اس طرح برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا وہ دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا جو اسلامیان ہند دو صدیوں سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں شکست کے بعد مسلمانوں پر غلامی کی جو شبِ تاریک مسلط ہوئی تھی مسلسل جد و جہد کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء میں اختتام پذیر ہوئی اور آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ غلامی کی سنگین چٹانوں سے اسلامیان ہند کے اس خواب اور تصور کو حقیقت کے پیکر میں تراشنے کے لئے قائد اعظم نے کونکن کا کردار ادا کیا تھا۔

قائداعظم اور استحکام پاکستان

۱۹۴۷ تا ۱۹۴۸

کسی نے سچ کہا ہے کہ پاکستان انتشار وافراتفری کے عالم اور ابتر حالات میں قائم ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی شاید ہی کسی اور قوم نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اس قدر محدود وسائل کے ساتھ اور ایسے سنگین حالات میں کیا ہو۔ اس نوزائیدہ قوم کو ورثے میں نہ کوئی مرکزی حکومت ملی تھی نہ اس کا کوئی دارالحکومت تھا، نہ اس کا کوئی انتظامی ادارہ تھا، نہ کوئی منظم دفاعی فوج۔ اس کے سماجی اور انتظامی وسائل بھی بے حد قلیل تھے۔ ضروری سازوسامان مفقود تھا۔ حیب کہ اعداد وشمار کا تو کوئی تذکرہ ہی بے سود ہے۔ تقسیم ہند کے خلاف پنجاب میں آگ اور خون، ہلاکت اور بربادی کا جو ہولناک کھیل سکھ مورچے کی خون آشامی نے کھیلا تھا اس کی وجہ سے پنجاب کا وسیع علاقہ ویران کھنڈر بن چکا تھا۔ مواصلاتی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں ہندو اور سکھ تاجروں اور انتظامی عملے کی مکمل نقل مکانی نے معیشت کو تقریباً اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ خزانہ خالی تھا۔ کیونکہ ہندوستان نے پاکستان کو زر مبادلہ کے بقایاجات کا وہ حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا جو اس کا اپنا حق تھا۔ ان سب سے بڑھ کر اس نوزائیدہ قوم پر ان آٹھ لاکھ مہاجروں کی کفالت کا بوجھ بھی آن پڑا تھا جو اس طویل اور انتہائی گرم موسم میں وحشت و بربریت اور عدم تحفظ کی بنا پر شمالی ہند کے میدانی علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان

آئے تھے۔ اگران تمام مسائل نے پاکستان کی انتظامی اور اقتصادی کمزوریوں کو ظاہر کر دیا تھا تو نومبر ۱۹۴۷ء میں ریاست جوناگڑھ (جس نے بنیادی طور پر پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں فیصلہ دیا تھا) پر بھارت کی فوج کشی اور اکتوبر ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۴۸ء کے درمیان انضمام کشمیر کے مسئلہ پر ہونے والی اس جنگ سے اس نوزائیدہ مملکت کی وہ فوجی کمزوریاں بھی عیاں ہوگئیں تھیں جو اس کو ورثے میں ملی تھیں۔ ان تمام حالات میں بھی پاکستان کا زندہ سلامت رہنا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

اور یہ معجزہ صرف ایک فردِ واحد کے دستِ کرشمہ ساز کا نتیجہ تھا اور وہ شخص تھا قائداعظم محمد علی جناح۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک مرحلہ پر پاکستان کو ان جیسے کرشمہ ساز شخص کی ہی ضرورت تھی۔ اور اس شخص نے یہ ضرورت نہایت حسن وخوبی سے پوری کی۔ امرواقعہ یہی ہے کہ صرف قائداعظم ہی یہ معجزہ نما کام کر سکتے تھے۔ کیونکہ بقول لندن ٹائمز "وہ ان لوگوں کے لئے، اس قوم کے لئے جو ان کی رہنمائی میں یہاں تک آئی تھی، قائداعظم سے بھی بڑھ کر، سربراہ مملکت سے بھی زیادہ سربلند اور اس اسلامی مملکت کے، جس کی بنیاد خود انہوں نے رکھی تھی، معمار سے بھی کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتے تھے۔"

تمام حالات وواقعات کا دیانت داری سے تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہو گا کہ یہ نوزائیدہ قوم اپنی ہنگامہ خیز پیدائش کے بعد ہی، پیش آنے والے ایسے تباہ کن اور ہولناک بحران میں بھی محض اس لئے زندہ سلامت رہی کہ اس دور میں قائداعظم امورِ مملکت کے نگران تھے۔ پاکستان کے عوام کو ان پر جو بے پناہ اعتماد تھا، لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے جو زبردست عقیدت ومحبت تھی، قائداعظم نے اُسی کو بروئے کار لاکر اس قوم کو درپیش مشکلات اور مصائب سے نمٹنے کے لئے حوصلہ عطا کیا اسے ان تباہیوں اور بربادیوں اور ہولناکیوں کا نئی توانائیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عزم عطا کیا۔ آزادی نے ان کے سینوں میں حب الوطنی کے جن جذبات کو بھڑکایا تھا

ان کی حدت و حرارت اور توانائی کا رخ تعمیری سرگرمیوں کی سمت موڑ دیا۔
بلاشبہ یہ وہ دور تھا جب قائداعظم بہت تھک چکے تھے۔ ان کے قویٰ اضمحل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے موسمِ گرما سے ہی ان کی صحت جواب دے گئی تھی اور اب وہ ہڈیوں کا پنجرہ ہو کر رہ گئے تھے۔ واقعتاً ان کا وجود ایسا ہو کر رہ گیا تھا جیسا کہ ماضی کا چلتا پھرتا سایہ ——— اس علالت، اس کمزوری اور اس شدید تھکن کے باوجود انہوں نے اس نئے ملک اور نئی مملکت کی زندگی کے پہلے انتہائی اہم اور نازک سال میں ذمہ داریوں کا بیشتر بھاری بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا۔ انہوں نے نئی مملکت کی پالیسیاں وضع کیں، قوم کو درپیش مسائل کی واضح نشاندہی کی اور انہیں حل کرنے کے لئے انتھک کام کیا۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی، سرکاری ملازمین اور مسلح افواج کو نہ صرف ان کے فرائض سے آگاہ کیا بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ قوم نے ان سے کیا توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

اس کے باوجود کہ شمالی ہندوستان میں ہونے والے فسادات خاصے اشتعال انگیز تھے۔ قائداعظم نے بہر قیمت نظم و نسق برقرار رکھنے اور امن و امان مستحکم کرنے کے لئے مؤثر طریقے اختیار کئے۔ اکتوبر، ۱۹۴۷ء میں وہ کچھ عرصے کے لئے لاہور منتقل ہو گئے تھے تاکہ وہاں مہاجرین کے آنے والے مسلسل اور زبردست سیلاب سے پیدا ہونے والی دہماکہ خیز صورت حال کا موقع پر قریب سے جائزہ لے سکیں۔ ان لٹے پٹے بے سہارا افراد کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کرنے کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں ان کی آباد کاری کے لئے، ان کو نئی قوم کا جزو لاینفک بنانے کے لئے حکمت عملی تیار کر سکیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان شکستہ حال، بے گھر اور بے در لوگوں میں نئے وطن سے وابستگی کا والہانہ جذبہ اور احساس زیادہ شدید کر سکیں۔ یہ وہ دور

مخاجیب براعظم ہندوستان کے طول و عرض میں جذبات انتہائی مشتعل تھے، لیکن انہوں نے کبھی ہوشمندی اور توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود انہوں نے ہمیشہ سنجیدگی، بردباری، متانت اور ثابت قدمی سے کام لیا۔ ان اشتعال انگیزیوں کے پس منظر میں انہوں نے اہالیان لاہور کو انتقامی کارروائی سے باز رکھا۔ انہیں صبر و ضبط کی تلقین کی اور اقلیتوں کی حفاظت کرنے کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہوئے مہاجرین کی آبادکاری کی طرف پوری توجہ اور انہماک سے کام کرنے کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے اقلیتوں کو واضح اور قطعی انداز میں تحفظ کی ضمانت دی۔ ان میں اعتماد اور تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ ان کی دلجوئی کی، انہیں دلاسہ دیا۔ ان کے مجروح جذبات و احساسات کو مندمل کرنے کے لئے مسیحائی سے کام لیا۔

ساتھ ہی قائداعظم نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا، ان کے مسائل پر توجہ دی۔ ان صوبوں کے عوام کو ایک نئی امید سے ہمکنار کیا۔ پاکستان سے وابستگی کے جذبات کو تیز تر کیا اور انہیں نئی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں برطانیہ کی فارورڈ پالیسی کو ختم کر دیا اور وزیرستان ایجنسی سے فوجیں ہٹا کر پٹھانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ بھی پاکستان کے جسدِ سیاست کا لازمی جزو ہیں۔ انہوں نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی ایک نئی وزارت قائم کی اور بلوچستان میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ انہوں نے کراچی کی حیثیت کے متنازعہ مسئلہ کو حل کیا۔ ریاستوں کے پاکستان میں انضمام کو یقینی بنایا۔ بالخصوص قلات کی ریاست کے انضمام کو یقینی بنایا جو اس وقت کے حالات میں بہت پیچیدہ مسئلہ دکھائی دیتا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے کٹھن مذاکرات بھی جاری رکھے اور برطانوی حکومت کے دفتر دولت مشترکہ سے مسلسل مراسلت

بھی کرتے رہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ مشرقی پنجاب میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے دولت مشترکہ کے دفتر کو مجبور کیا جائے اور دونوں مملکتوں میں پائی جانے والی کشیدگی کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ برِاعظم ہندوستان میں امن واستحکام پیدا ہو سکے۔

انہوں نے مختلف صوبوں کے گورنروں سے مراسلت کی، وزراء اور سیاستدانوں سے مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مختلف صوبوں کی صورتِ حال سے گہرے طور پر آگاہ رہے اور جہاں کہیں ضروری سمجھا متعلقہ افراد کو مشورہ بھی دیا اپنے منصب کی تمام تفصیلات اور ذمہ داریوں پر توجہ دی۔ کابینہ کے اجلاسوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ انھوں نے مہاجرین کی آباد کاری کے لئے قائداعظم ریلیف فنڈ کمیٹی کے اجلاسوں کی گھنٹوں صدارت بھی کی۔ اس کے باوجود کہ مہلک بیماری ان کی تمام تر توانائیوں کو چاٹ چکی تھی۔ وہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کے لئے ایک تکلیف دہ سفر کرکے کوئٹہ سے کراچی پہنچے کیونکہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان، پاکستان کی مالیاتی آزادی کا نشان تھا۔

اور ان سب کے علاوہ اس دور کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل سے نمٹنے اور انتظامیہ کا ایک موثر نظام اور ادارہ قائم کرنے، مسلح افواج کی تنظیم نو کرنے اور ایک ترقی پسند اور فلاحی مملکت کی ٹھوس بنیادیں ڈالنے کے لئے وہ ان فعال افراد پر مشتمل جماعت کی رہنمائی کرتے رہے انہیں نئی راہیں دکھاتے اور حوصلہ دلاتے رہے جو انہوں نے اپنے گرد جمع کی تھیں۔ جناح نے اپنے مشن کی تکمیل پر کلی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام آخری پیغام میں کہا تھا "آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کی تعمیر کریں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کی تعمیر کریں۔"

قیام پاکستان کے ساتھ ہی قائد اعظم نے اپنے شانوں پر جو ذمہ داریاں لی تھیں ان کی تکمیل کرتے ہوئے وہ بالآخر موت کی گہری نیند سو گئے لیکن اس مختصر عرصے میں بقائے پاکستان کے لئے جتنا کام انہوں نے کیا کسی اور نے نہیں کیا۔ قائد اعظم کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ آپ کی موت پر سابق وزیر ہند پیتھک لارنس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ "گاندھی ایک قاتل کے ہاتھوں مارا گیا، لیکن جناح نے پاکستان سے گہری وابستگی اور لگاؤ کی راہ میں جان دی۔"

حرفِ آخر

قائداعظم نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی امن داماں کے خواہاں تھے۔ وہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے عشرے میں جب ہندوؤں اور کانگریس نے اس اصول کو بے جانے بوجھے تج دیا اور اس کے برعکس اور متضاد راہ اختیار کی تو اسی روّیے اور بعض دیگر عوامل نے قائداعظم کو بالآخر مطالبۂ پاکستان پر مجبور کر دیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ خود مطالبۂ پاکستان بھی، جیسا کہ خود قائداعظم نے وضاحت کی "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اسی اصول کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ یعنی مطالبۂ پاکستان کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر اپنے نظریات، خیالات اور روایات کے مطابق اپنے اپنے امور کی نگرانی کریں تاکہ برصغیر میں دونوں قوموں کے لئے امن اور خوش ہمسائیگی کے ساتھ زندہ رہنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس تشریح اور توضیع سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ دراصل پورے براعظم ہندوستان کی آزادی کا طالب تھا۔ اس طرح گویا قائداعظم نہ صرف پاکستان کے لئے مصروف تھے بلکہ ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کی آزادی یعنی ہندوؤں کی آزادی کے لئے بھی جدوجہد کر رہے تھے۔

تاہم آزادی کے لئے قائداعظم کا یہ جوش وخروش صرف مسلمانوں یا ہندوستان کی حد تک محدود نہ تھا۔ یہی جوش و ولولہ ان تمام محکوم قوموں کے لئے بھی ان کے دل میں موجزن تھا جو غیر ملکی راج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمہ وقت، پورے انہماک اور تندہی کے ساتھ اپنے کروڑوں عوام کے لئے جدوجہد آزادی میں مصروف تھے، وقت نکال کر انہوں نے کئی مواقع پر ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی اپنی اور اسلامیان ہند کی طرف سے مکمل اخلاقی حمایت بھی کی۔ خاص طور پر مغرب د شمالی براعظم افریقہ کے مغربی مسلم ممالک میں فرانسیسی نوآبادیوں، افریقہ میں سابق اطالوی نوآبادیوں، مصر، مشرق وسطیٰ اور انڈونیشیا میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی، انہوں نے کھل کر حمایت کی۔ اسی بنا پر نوآبادیاتی ممالک کے محکوم عوام کی آزادی کی حمایت قیام کے وقت ہی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول بن گئی۔

جناح تمام اقوام عالم سے دوستی کے قائل تھے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی معاملات میں دیانت، انصاف اور ایمان داری پر یقین رکھتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہندوستان کی طرف سے مستقل یہ کوششیں جاری تھیں کہ کسی نہ کسی طرح گلا گھونٹ کر پاکستان کو مار دیا جائے۔ ان کی طرف سے ہندوستان کو ہمیشہ شاخ زیتون ہی پیش کی گئی۔ انہوں نے ہر ایک کو عفو و درگزر سے کام لینے کی تلقین کی۔ ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں باہمی دشمنی ترک کر دیں۔ دلوں کو تمام تلخیوں اور کدورتوں سے پاک کر دیں اور تشدد کے تمام تصورات ذہنوں سے نکال دیں۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تمام اختلافات کو ہمیشہ پُرامن طریقے سے حل کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے برّاعظم ہندوستان کے لئے "منرو نظریہ"، کے مطابق کسی نہ کسی قسم کا کوئی انتظام قائم کرنے کا خیال

ظاہر کیا، بھارت کو مشترکہ دفاع کی تجویز بھی پیش کی۔

قائداعظم ملت مسلمہ کے مکمل اتحاد کے بھی علمبردار تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کے عشرے میں جب ترک قوم اپنی جہد بقا میں مصروف تھی قائداعظم نے اس سے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ قرطاس ابیض (۱۹۳۹) اور پھر ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے بعد کے عشروں میں یہودیوں کی نقل مکانی اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں انہوں نے برطانیہ سے یقین دہانیاں حاصل کرلی تھیں۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے دوران جب انڈونیشیا پر ولندیزیوں نے دوبارہ قبضہ جمانے کی کوشش کی تو قائداعظم نے اس پر سخت نکتہ چینی کی۔ اور جوابی اقدام کئے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء کے دوران پاکستان کے زیر اہتمام جو چند بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں ان کا تصور قائداعظم کی فکر کا نتیجہ تھا۔

قائداعظم کا سماجی فلسفہ اخوت، مساوات، بھائی چارے اور عدل عمرانی کے انسان دوست اصولوں پر یقین محکم سے عبارت تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ برّاعظم ہندوستان میں انسانی حقوق سے محرومی کے خدشے اور خطرے نے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو قیام پاکستان کے مطالبہ پر مجبور کیا تھا۔ اسی لئے وہ اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان کی تعمیر عدلِ عمرانی کی ٹھوس بنیادوں پر ہونی چاہیئے۔ انہوں نے پُرزور انداز میں تلقین کی کہ پاکستان کی سرزمین سے ہر قسم کے استحصال کا خاتمہ کر دیا جائے۔ انہوں نے دولت مندوں کو مشورہ دیا کہ بدلتے ہوئے حالات میں وہ اپنا انداز فکر تبدیل کرلیں۔ انہوں نے سرکاری افسروں پر زور دیا کہ وہ ایک ایسی فضا کو جنم دیں اور ایسے جذبے اور لگن سے کام کریں کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف ہو سکے اور اس کو اپنا حق مل سکے۔"

قائداعظمؒ جمہوریت پر یقین رکھتے تھے، لیکن وہ اس بات کے بھی سختی سے قائل تھے کہ پاکستان کے مستقبل کے آئین میں اسلام کے بنیادی اور لازمی عنصر کا اظہار ہونا چاہیئے

کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ "اسلام اور اس کے تصوّرات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔" انہوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ اسلام کے عظیم الشان اصولوں ہی کو پاکستان کا رہبر و رہنما ہونا چاہیئے۔ وہ حقوق، مراعات اور فرائض میں مساوات، ہر ایک سے ہر معاملے میں حق و انصاف سے کام لینے، اور کسی تفریق کے بغیر سب لوگوں کے لئے مساوی شہریت کے قائل تھے۔

اپنی قوم کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کے لئے زندگی بھر جدوجہد کرنے والے جناح نے صرف اپنی قوم کی فلاح اور بقا کے لئے مطالبۂ پاکستان کو اپنا مسلک بنایا۔ یہ مطالبہ کیونکہ اپنی اصل میں نہایت غیر معمولی اور غیر روایتی تھا۔ اس لئے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کا غلطی کرنا اور اس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونا لازمی امر تھا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر ان کی شدید مخالفت اور مزاحمت بھی لازمی تھی۔ تاہم افسوس ناک بات یہ ہے کہ انہیں نہ صرف اس دور میں غلط سمجھا گیا بلکہ آج بھی بعض لوگ ان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تاہم یہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس عظیم شخص اور اس کے عظیم مشن کو سمجھنے کی اور اس کی عظمتوں کو تسلیم کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کیونکہ مخالفانہ جذبات کی گرداب حقائق سے چھٹنے لگی ہے۔ چنانچہ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ عصرِ حاضر میں شاید ہی کسی اور رہنما کو اتنے شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہو جن الفاظ میں جناح کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تعریف ایسے لوگوں نے بھی کی ہے جو ان کے نظریات کے مخالف تھے۔ آغا خان کا کہنا ہے "میں جتنے لوگوں سے ملا ہوں وہ ان سب سے عظیم تھے۔" "ورڈکٹ آف انڈیا" کے مصنف بیورلی نکلس نے انہیں ایشیا کا انتہائی اہم شخص قرار دیا ہے۔ اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے جو ۱۹۴۸ء میں مغربی بنگال کے گورنر تھے ان کے بارے میں کہا ہے۔ "وہ اس صدی کے سب سے ممتاز فرد تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔"

عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عظام پاشا نے انہیں عالم اسلام کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک قرار دیا ہے۔" مفتیٔ اعظم فلسطین نے ان کی موت کو تمام عالم اسلام کے لئے ایک "عظیم نقصان" قرار دیا ہے۔ تاہم قائد اعظم کی ذاتی اور سیاسی کامیابیوں کو نہایت جامع انداز میں انڈین نیشنل کانگریس کے فارورڈ بلاک ونگ کے سربراہ سرت چندر بوس نے چند الفاظ میں سمو دیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم کے انتقال پر انہوں نے کہا: "مسٹر جناح ایک وکیل کی حیثیت سے عظیم تھے۔ ایک کانگریسی کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلّم ہے۔ وہ مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے بھی عظیم تھے۔ ایک عالمی سیاستدان اور مدبّر کی حیثیت سے بھی وہ عظیم رہے اور ایک عملی انسان کی حیثیت سے وہ عظیم ترین تھے۔ مسٹر جناح کے انتقال سے دنیا ایک عظیم ترین مدبّر اور پاکستان اپنے خالق، فلسفی اور رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔

یہ تھی قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت اور یہ تھا ان کا مشن۔ یہ تھیں ان کی کامیابیاں اور ان کی کامرانیاں۔ اس لئے اگر آج بھی قوم انہیں احسان مندی اور تشکّر کے جذبات سے یاد کرتی ہے اور اگر آج بھی ۸ کروڑ پاکستانیوں کے ذہن میں ان کی یاد ہمیشہ کی طرح تازہ ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگرچہ انہیں جدا ہوئے ایک تہائی صدی گزر چکی ہے لیکن آج بھی پاکستان کی سیاسی زندگی پر ان کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ پاکستانیوں کے لئے ان کے ارشادات آج بھی متنازعہ مسائل اور سیاسی تنازعات میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان جس کا قیام ایک معجزہ ہے صرف ایک شخص کی بے مثل سیاسی بصیرت اور ذہانت کی زندہ علامت ہے اور وہ شخص ہے قائد اعظم محمد علی جناح۔

maablib.org

اشاریہ

آزاد پارٹی ۸۰، ۸۷

آسام ۸۰، ۸۴، ۹۱، ۱۱۰، ۱۲۵، ۱۲۶

آغاخان ۲۲، ۳۵، ۴۳، ۷۸، ۷۹، ۱۲۰، ۱۴۳

آگرہ ۱۴۱

آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز کنونشن ۱۱۳

آل انڈیا مسلم ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن ۱۱۳

آل پارٹیز کانفرنس ۶۳

آل پارٹیز مسلم کانفرنس ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۸۱، ۸۶، ۱۰۳

آئی۔ این۔ اے ۱۱۸

اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا ۱۲، ۵۰، ۵۱

اتحاد ملت ۸۱

اٹیلی، لارڈ کلیمنٹ۔ ۱۱۷

احمد آباد ۱۲۴

اچاریہ، سی راجگوپال ۱۱۴، ۱۱۵

احرار ۸۱

اردو ۱۹، ۲۲

آسٹریلیہ ۸۴

اسٹیٹ بنک آف پاکستان ۱۳۸

اسلام آباد ۸

اسلامیان ہند ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۲۰، ۴۳، ۴۴، ۶۰،
۶۷، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۹۱،
۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱،
۱۰۲، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۱

اسماعیل، نواب محمد ۵۸

افریقہ ۱۴۱

افسر آذر ۱۰

اقبال، علامہ محمد ۸۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶

اکالی دل ۱۲۴ ـ الہ آباد ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶

الیگزینڈر، اے، وی ۱۱۸

امام، سر سید علی ۳۸

امبیدکر، بی آر ۱۰۱

امپیریل لیجسلیٹو کونسل ۲۸، ۳۲، ۳۴، ۳۶،
۴۰، ۴۲، ۴۳، ۴۸،

امیر علی، سید ۳۵

انجمن ضیاء الاسلام ۲۶، ۳۴

انڈی پینڈنٹ پارٹی ۴۷
انڈین مسلمان ایسوسی ایشن ۲۶
انصاریؒ ڈاکٹر مختار ۲۸، ۵۸
انگریز (انگریزوں) ۱۳، ۱۵، ۴۱، ۷۷، ۷۸،
۸۷، ۸۸، ۹۸، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۱
انگریزی اخبار ۱۹
انگلستان ۲۳، ۲۵، ۳۵، ۷۳، ۷۴، ۸۹، ۱۱۷،
۱۲۶، ۱۲۹،
اورینٹ ایئرویز ۱۱۴
اولوا، جوکھم ۱۷
ایڈ ناورک کانرڈ ۱۳۲
ایکٹ ۱۹۰۹ء ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۵۴، ۵۶، ۶۵
ایکٹ ۱۹۱۹ء ۸۱
ایکٹ انڈین کونسلز ۱۸۹۲ء ۲۱
ایکٹ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۳۰ء ۶۷،
۷۷، ۷۸، ۸۱، ۸۳، ۱۰۰
ایکٹ وقف ۱۹۱۳ء ۳۷
بالو، بھوپندرناتھ ۲۹
بحر اوقیانوس ۱۱۷
برطانوی پارلیمنٹ ۲۴
برطانوی ٹیکسٹائل ۴۴
برطانوی خطابات ۱۲۲
برطانوی لبرل ازم ۲۳
برطانیہ ۱۲، ۱۷، ۲۰، ۲۴، ۳۰، ۳۵، ۲. ۵۶،
۵۸، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۸۱، ۸۹، ۹۴، ۱۰۰، ۱۰۸،
۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳،
۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۷، ۱۴۴
برما ۱۱۰ ۔ برہمو سماج ۲۰
بسمارک، ادٹو۔ وین ۱۲، ۱۲۰
بسنت، مسز اینی ۳۲، ۴۸
بغاوت ہند ۱۴
بلوچستان ۵۸، ۵۹، ۶۵
بمبئی ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۳۴، ۴۱،
۴۳، ۴۸، ۵۵، ۶۵، ۷۴، ۷۶، ۸۴،
۸۸، ۱۱۴، ۱۲۴
بمبئی پریذیڈنسی ۵۸، ۶۵
بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن ۲۵
بمبئی ہائی کورٹ ۳۵
بندے ماترم ۹۸
بنرجی، سرنیدرناتھ ۲۴، ۴۰
بنگال ۱۹، ۵۷، ۵۹، ۶۵، ۷۰، ۸۰، ۸۴،
۸۹، ۹۱، ۹۶، ۱۱۸، ۱۲۹، ۱۴۳
بوس، سبھاش چندر ۷۰

بوس، سرت چندر ۳۲، ۴۴، ۱۴۱

بہار ۸۰، ۸۴، ۱۲۴

بھارتی پریس ۱۱۱ ۔

پارسی ۴۲، ۶۱

پارلیمانی بورڈ ۸۰

پارلیمینٹیرین ۱۱، ۲۸، ۳۱

پاکستان ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۳۳، ۶۷، ۹۲، ۹۷، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۴

پال، بپن چندرا ۷۴

پٹیل، ولبھ بھائی ۳۲، ۱۲۸

پرشاد، بالو ماچند ۷۰

پنجاب ۵۳، ۵۷، ۵۹، ۶۵، ۷۰، ۷۸، ۸۴، ۸۹، ۹۱، ۹۴، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۸ ۔

پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی ۷۸، ۷۹، ۸۰

تحریک عدم تعاون ۵۰

ترکی ۵۰، ۵۱، ۷۲

تلک، بال گنگا دھر ۲۲

۳ جون پلان ۱۲۷ ۔

جاپان ۱۱۰، ۱۱۷

جیمز، سر فریڈرک ارنسٹ ۳۳

جمعیت علمائے کانفرنس ۶۹

جمعیت علمائے ہند ۷۱

جناح، محمد علی ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۷۹، ۸۲، ۸۳، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴

جرمنی ۱۳۲ ۔ جنوبی افریقہ ۲۹، ۳۰، ۴۸، ۱۲۶

جنوبی ایشیا ۱۰۸

جوائنٹ پارلیمینٹری رپورٹ ۴۷

جونا گڑھ ۱۳۵

جیکار، مکند راماراؤ ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۶۶

چرچل، سر ونسٹن ۱۱۷، ۱۳۱

چودہ نکات ۶۶، ۶۷، ۱۰۳

چوہدری عبدالمتین ۵۸

چھتاری، سر احمد سعید خان نواب آف ۷۸

حبیب بنک ۱۱۴ ۔

حسن، سر وزیر ۳۵، ۷۶

خان، پہلوان ۷۹۔
خان، حکیم اجمل ۳۵
خان، سر ذوالفقار علی ۵۸
خان، سر سکندر حیات ۹۱، ۹۴
خان، سر سید احمد ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۵
خان، سر شفاعت احمد ۷۸
خان، صاحب ڈاکٹر ۸۰
خان، مولانا محمد اکرم ۸۰
خان، مولانا ظفر علی ۸۱
خدائی خدمت گار ۸۰
خطبۂ الہ آباد ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶
خلافت تحریک ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۵۸، ۶۲، ۷۳
خلافت کانفرنس ۵۲، ۸۰
داس، چترنجن ۴۷، ۵۰
دولت مشترکہ ۱۲۷، ۱۳۸
دہلی ۵۸، ۶۹، ۷۵، ۱۱۳
دہلی مسلم تجاویز ۵۸، ۶۶، ۶۷
ڈیگال، چارلس ۱۳۲
راجکوٹ ۱۵ - رام گوپال ۶۲
رائے، راجہ رام موہن ۲۰
رائے، لالہ لاجپت ۶۴
رتن بائی ۴۲۔
رضی، حیدر، خواجہ ۱۰
رولٹ ایکٹ ۳۰
رولٹ کمیٹی ۱۹۱۹ء ۳۱
رئوف شاہ ۸۰۔
رینج، ارنس ۱۰۱
سائمن کمیشن ۷۲، ۷۷
سپرو، سر تیج بہادر ۶۱
سرحد ۵۸، ۵۹، ۶۵، ۷۸، ۸۰، ۸۴، ۸۹،
۱۲۵، ۱۲۶۔
سعد اللہ، سر محمد ۹۱
سکھ ۶۱، ۶۳، ۱۲۴، ۱۳۴.
سندھ ۵۸، ۵۹، ۶۵، ۷۸، ۸۴، ۸۹
سندھ مدرسۃ الاسلام ۱۵
سندھی، شیخ عبدالمجید ۸۰
سنگاپور ۱۲۸۔
سوئٹزرلینڈ ۸۹
سی۔ آر فارمولا ۱۱۴
سی۔ پی ۸۰۔ ۸۴
شدھی، سنگھٹن تحریکیں ۵۱
شرر، عبدالحلیم ۱۰۳

شفیع سر محمد ۵۸، ۷۲، ۷۳

شفیع لیگ ۷۲۔

شملہ کانفرنس ۱۱۶، ۱۱۷

شیواجی ۲۲

طیب جی، بدرالدین ۲۵، ۳۸

عبدالحلیم چوہدری ۸۰

عبدالرحیم سید ۵۸۔

عبدالعزیز، سید ۸۰

عبدالقیوم، سر ۵۸، ۷۸، ۸۰

عبوری وزارت (حکومت) ۸۸، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳،
۱۲۴، ۱۲۶۔

عثمانیہ (سلطنت) ۵۱

عظام پاشا عبدالرحمٰن ۱۴۴

علی برادران ۳۲،

علی، چوہدری رحمت ۱۰۴

علیگڑھ ۱۵، ۴۱، ۱۰۳۔

عیسائی ۶۱

فضل الحق، مولوی ۸۰، ۹۱

فضل حسین، سر میاں ۵۳، ۷۱، ۷۸، ۷۹

فلسطین ۱۴۲

قائداعظم دیکھئے، جناح، محمد علی

قائداعظم اکادمی ۸،

قائداعظم جناح۔ اسٹڈیز ان انٹرپریٹیشن ۹

قائداعظم حیات وخدمات ۷

قائداعظم ریلیف فنڈ ۱۳۸

قریشی، اشتیاق حسین ۲۰

کاٹجو، کیلاش ناتھ ۱۴۳

کانگریس (انڈین نیشنل) ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴،
۲۵، ۲۶، ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲،
۴۳، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۵، ۶۳،
۶۵، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۴، ۷۷، ۷۹، ۸۴، ۸۵،
۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۹۹
۱۰۰، ۱۰۱، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۱،
۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۴۱

کچلو، سیف الدین ڈاکٹر ۳۸

کراچی ۱۵، ۱۶، ۱۳۸

کرپس تجاویز ۱۱۰

کرپس، سر اسٹیفورڈ ۱۱۸

کرپس مشن ۱۱۰، ۱۱۴

کرسچین مشنری سوسائٹی ہائی اسکول، ۱۵

کرشک سیمتی پارٹی ۸۰

کرم حیدری ۹۔

کشمیر ۱۳۵، ۱۳۷

کلکتہ ۱۹، ۲۶، ۳۶، ۳۹، ۴۶، ۹۶، ۱۱۳، ۱۱۴،
۱۲۳، ۱۲۴۔

کلکتہ نیشنل کنونشن ۶۰

کیمونل ایوارڈ ۶۷، ۸۲
کوپر کی عبوری وزارت ۸۸
کوپلینڈ، سر ریجینلینڈ ۸۹
کوئٹہ ۱۳۸۔
کیبنٹ مشن ۱۱۸، ۱۲۴، ۱۲۵
کیبنٹ مشن پلان ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۸
کیمبرج ۱۰۳
کینیڈا ۵۵۔
کولنس اور لاپیر ۱۲۸
کوہاٹ ۵۲۔ کیور ۱۲
کھپارڈے جی۔ ایس ۷۴
گاندھی، موہن داس کرم چند ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۶۳، ۶۸، ۷۰، ۹۷، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۹
گجرات سبھا ۸۴۔
گجراتی ۱۹
گڑھ مکیشتر ۱۲۴
گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی ۱۵
گنیش ۲۲
گوکھلے، گوپال کرشن ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۲۹، ۴۰
گول میز کانفرنس ۶۷، ۶۸، ۷۳
گریبالڈی جی ۱۲۔
لارڈ سائمن ۱۸
لارنس، لارڈ پیتھک ۱۱۸، ۱۳۹
لال جی ۷۴
لاہور ۵۲، ۵۳، ۹۴، ۹۶، ۱۰۸، ۱۱
لائن سسٹم ۱۲۶
لکھنؤ ۴۳، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۷،
لندن ۱۵، ۱۶، ۶۷، ۷۳، ۱۲۴
لندن ٹائمز ۱۳۵
لیکنزران ۱۶۔
لینن ۱۲
مالویہ، مدن موہن ۷۴، ۴۴، ۶۴، ۷۰
ماؤنٹ بیٹن پلان ۱۲۷، ۱۳۳
ماؤنٹ بیٹن پیپرز ۱۲۹، ۱۳۰
ماؤنٹ بیٹن، وائی کاؤنٹ ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۷
ماسپول ۱۲۸
مجاہد شریف الی ۷۸، ۱۰۰
مجلس آئین ساز (پاکستان) ۴۳، ۴۹، ۵۳، ۵۶
محمد علی، مولانا جوہر ۴۴، ۴۸، ۵۸، ۷۲، ۷۳
محمدی اسٹیم شپ کمپنی ۱۱۴
مدراس ۱۹، ۴۸، ۹۶، ۱۱۴
مدراس پریزیڈنسی مسلم پروگریسیو پارٹی ۸۰

مڈی مین کمیٹی ۵۶
مرکزی مجلس قانون ساز ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۵، ۷۴، ۸۰
مسارک ۱۲
مسجد کانپور ۳۵
مسعود نبی نور ۸
مسلم اخبارات ۳۶
مسلم ایوان تجارت ۱۱۳
مسلم پارلیمنٹری پارٹی ۸۰
مسلم پریس ۱۱۲، ۱۱۳
مسلم پولیٹیکل پارٹی ۸۰
مسلم کمرشیل بنک ۱۱۴
مسلم لیگ ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۶۰، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۱۲، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۹
مسلمان (مسلمانوں) ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۸، ۲۹، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۹، ۷۲، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۹، ۸۲، ۸۳، ۸۶، ۸۹، ۹۰، ۹۲، ۹۴، ۹۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۱۔
مظہر الحق، ڈاکٹر ۳۸۔

ملت کا پاسبان ۹
منٹو، لارڈ ۳۰
مورلے، منٹو اصلاحات ۳۳، (۱۹۰۹ء)
مون، پنڈرال ۸۴، ۸۹
مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۴۲، ۵۶، ۵۷۔
موہانی، حسرت مولانا ۳۸
مہتا، سر فیروز شاہ ۲۴، ۲۵، ۴۰
میثاق لکھنؤ ۴۲، ۴۳، ۴۷، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۱۰۳
ناگپور ۸۴
نائیڈو، سروجنی ۳۷
ندوۃ العلماء ۳۶، ۳۷، ۴۱
نشتر، سردار عبدالرب ۱۳۲
نعمانی، شبلی مولانا ۳۶
نکلسن، بیوریلی ۱۴۳
نواکھالی ۱۲۴
نوروجی، دادا بھائی ۲۴، ۲۵، ۴۰
نہرو، جواہر لال ۳۳، ۷۰، ۹۴، ۹۸، ۱۰۵، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸۔
نہرو، موتی لال ۳۳، ۵۰، ۶۳
نہرو رپورٹ ۶۰، ۶۷، ۶۹

نیشنل کنونشن ۶۶
واڈ چمن لال ستیل ۶۴، ۱۷
واشنگٹن، جارج ۱۲
ورلڈ کٹ آف انڈیا ۱۴۳
وقف علی الاولاد ۲۹، ۳۱، ۳۵، ۳۶،
۱۳۷، ۱۳۹۔
ویول، لارڈ ۱۱۶، ۱۲۶، ۱۲۷
ہارون، سیٹھ عبداللہ ۷۸۔
ہدایت اللہ، سر غلام حسین ۷۸، ۸۰۔
ہندو (ہندوؤں) ۲۰، ۲۲، ۲۹، ۳۹،
۴۰، ۴۱، ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۵۸، ۵۹،
۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۶، ۷۱، ۸۹، ۹۱، ۹۹،
۱۰۲، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۸،
۱۳۴۔
ہندو مسلم فسادات ۲۲، ۱۲۵، ۱۲۴
ہندو مہاسبھا ۵۵، ۶۳
ہندوستان (ہند) ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۶،
۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸،
۳۰، ۳۱، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۴۳،
۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۴، ۵۵،
۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۱، ۶۵، ۶۶، ۷۳،
۷۴، ۸۳، ۸۴، ۹۰، ۹۱، ۹۴، ۹۸،
۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷،
۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۸،
۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹،
ہندی ۱۹، ۲۲
ہوم رول لیگ ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۴۸
ہیوم، سر آکٹیوین ۲۱۔
یوپی ۷۸، ۸۴، ۸۹، ۹۰
یورپ ۱۱۶
یوسف، سر محمد ۷۸
یوم نجات ۹۹
یوم سیاہ ۱۲۳
یونائیٹڈ پارٹی ۸۰
یونائیٹڈ مسلم پارٹی ۸۰
یونائیٹڈ مسلم نیشنلسٹ پارٹی ۸۰

قائدِ اعظم پر ایک معرکۃ الآرا تصنیف

QUAID-I-AZAM JINNAH

Studies in Interpretation

SHARIF AL MUJAHID

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات پر یہ ایک فکر انگیز، تجزیاتی محققانہ اور جزئیات نگاری سے بھرپور کتاب ہے۔ جسے جنوبی ایشیا کی جدید تاریخ کے ایک سنجیدہ طالب علم نے کئی سال کی محنت شاقہ، طویل تحقیق اور انتھک کاوش کے بعد تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً قائدِ اعظم اور اُن کی سیاست کو سمجھنے کے لئے لکھی جانے والی روائتی تحریروں سے نہ صرف اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ بانیٔ پاکستان کے بارے میں مزید تحقیق کی راہیں اجاگر کرتی ہے۔ اِس کا اندازہ درج ذیل آراء سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

- "نہایت وسیع اور محتاط تحقیق پر مبنی، یہ شاندار علمی کارنامہ ـــــ جس کی تدوین و ترتیب نہایت انفرادیت کی حامل ہے ـــــ زبردست تاریخی اور بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے" ـــــ آئن اسٹیفنز۔ سابق ایڈیٹر۔ "دی اسٹیٹسمین"۔
- "ایک بے مثل پُر مغز علمی کاوش" ـــــ پروفیسر رالف برے بنٹی، ڈائریکٹر، اسلامک اینڈ عریبین ڈیولپمنٹ اسٹڈیز، ڈیوک یونیورسٹی۔
- "آپ کی یہ شاندار کتاب . . . جناح پر ہمارے سامنے آنے والی کتابوں میں اب تک یقیناً سب سے منفرد کتاب ہے" ـــــ پروفیسر اینسلے ٹی ایمبری، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری اینڈ ڈائریکٹر، سدرن ایشین انسٹی ٹیوٹ، کولمبیا یونیورسٹی۔
- "ایک وقیع علمی کارنامہ" ـــــ پروفیسر تھیوڈور پی رائٹ جونیئر، ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس، اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک، البانی۔
- "قائدِ اعظمؒ کے بارے میں اتنا وقیع مطالعہ میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا" ـــــ ڈاکٹر کے پی کرونا کرن، پروفیسر اینڈ ہیڈ، ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس، یونیورسٹی آف دہلی۔
- "یہ کتاب جناح کی شخصیت کو داستان گوئی کے حصار سے نکال کر علمی سچائی اور حقائق کے دائرے میں لے آتی ہے۔ فی الواقعی ابھی تک اس جیسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے" ـــــ پروفیسر مارٹن گرین، ڈیپارٹمنٹ آف انگلش، ٹفٹس یونیورسٹی۔
- "جناح کے سیاسی افکار و خیالات کی نشوونما، بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق اُن میں رونما ہونے والی اُن تبدیلیوں کے اصل ماخذات اور محرکات کی تحقیق و جستجو پر مبنی ایک وقیع علمی کاوش جن کے نتیجے میں بالآخر پاکستان قائم ہوا" ـــــ دی ہندو (مدراس)۔
- ". . . [یہ کتاب اس امر کا بیّن اظہار ہے کہ] اس رجلِ عظیم کی شخصیت اور تاریخ میں اس کے کردار و مقام کا صحیح تعین کس طرح کیا جاسکتا ہے" ـــــ کے۔ ایچ۔ خورشید، قائدِ اعظمؒ کے سیکریٹری (۱۹۴۴ تا ۱۹۴۷)
- "پُر مغز اور فکر انگیز تصنیف . . . یہ کتاب بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھی گئی ہے۔ میری نظر سے شاید ہی کوئی اور کتاب گزری ہو جس میں اس قدر معتبر حوالہ جات درج کئے گئے ہوں۔ میرا تاثر یہ بھی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی زندگی پر . . . یہ تصنیف ایک نئے اور انوکھے انداز سے روشنی ڈالتی ہے" ـــــ خواجہ محمد صفدر، چیئرمین مجلس شوریٰ۔